کلیاتِ اسمٰعیل

از

حضرت مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب

سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ

دفتر اشاعت

دی اورینٹل پبلشنگ کمپنی

اورینٹل ہاؤس میرٹھ

سنہ ۱۹۱۰ء

زبان پریس دہلی میں باہتمام خواجہ حسین حسن نازک رقم چھپا

فہرست مضامین کلیات اسمٰعیل

اُردو

فارسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلیاتِ اسمٰعیل

مثنویات

۱- صنایع الٰہی

خدایا نہیں کوئی تیرے سوا
اگر تو نہ ہوتا تو ہوتا ہی کیا

تصوّر تری ذات کا ہے محال
کسے یہ سکت اور کہاں یہ مجال

تعقّل میں اتنی صفائی کہاں
تفکّر کو ایسی رسائی کہاں

یہاں عقل جاتی ہے آئی ہوئی
تخیّل پہ ہیبت ہے چھائی ہوئی

تفکّر کے جلتے ہیں پر اِس جگہ
تصوّر کا کٹتا ہے سر اِس جگہ

کسی کی یہاں دال گلتی نہیں
کسی کی یہاں چال چلتی نہیں
نہ ٹھہری کوئی ناؤ اِس موج میں
نہ پہونچا کوئی تیر اِس اوج میں
جلا اِس ہوا میں نہ کوئی چراغ
پریشاں ہوئے دل تھکے سب دماغ
جو ہوتی مُشابہ ترے کوئی چیز
تو کچھ کام کرتی سمجھ یا تمیز
ترا کوئی ہم جنس و ہمتا نہیں
گماں کا یہاں پاؤں جمتا نہیں
سمجھ کیا ہے؟ اور کیا سمجھ کی بساط؟
سمندر سے قطرہ کا کیا ارتباط؟
چلی بوند لینے سمندر کی تھا
یکایک لیا موج نے اُس کو کھا
ہوئی آپ ہی گم تو پائے کسے؟
بتائے وہ کیا اور جتائے کسے؟
اگر تیری قدرت کی کاریگری
نہ کرتی سمجھ بوجھ کی رہبری
تو وہ سر پٹکتی ہی رہتی مدام
طلب میں بھٹکتی ہی رہتی مدام
بنائی ہے تو نے یہ کیا خوب چھت
کہ ہے سارے عالم کی جس میں کھپت
یہ سقف کہن ہے ابھی تک نئی
اِسے دیکھتی یوں ہی دنیا گئی
زمیں پر گئیں کتنی نسلیں گزر
رہی اس کی ہیئت پہ سب کی نظر
اسے سب نے پایا اِسی ڈھنگ میں
اسے سب نے دیکھا اِسی رنگ میں
عجب ہے یہ خیمہ رسن ہے نہ چوب
ہمیشہ مُصفّا ہے بے رُفت و روب
نہ در ہے نہ منظر نہ کوئی شگاف
اِدھر سے اُدھر تک ہے میدان صاف
جھروکا نہ کھڑکی نہ در ہے نہ چھید
عجب تیری قدرت عجب تیرے بھید

کہیں جوڑ ہے اور نہ پیوند ہے — جدھر دیکھئے اُس طرف بند ہے

بنایا ہے کیا دستِ قدرت نے گول — چُرسن ہے نہ جُھرّی نہ سلوٹ نہ جھول

عجب قدرتی شامیانہ ہے یہ — نظر کی پہنچ کا ٹھکانا ہے یہ

ہوا کو دیا تو نے کیا خوب رنگ — سراسیمہ ہے عقل اور فکر دنگ

پرے اُس کی حد سے نہ جائے نظر — جہاں تک نظر جائے آئے نظر

یہ تارے جو ہیں آتے جاتے ہوئے — چمکتے ہوئے جگمگاتے ہوئے

نظر آرہے ہیں عجب شان سے — ہیں لٹکے ہوئے سقفِ ایوان سے

چراغ ایسے روشن جو بن تیل ہیں — یہ تیری ہی قدرت کے سب کھیل ہیں

یہ لعل و گُہر ہیں جو بکھرے پڑے — زمیں سے بھی ہیں اِن میں اکثر بڑے

کوئی اِن میں سورج کوئی اِن میں چاند — کہ یہ ماہ و خور سامنے جن کے ماند

نظر میں جو اتنے سے آتے ہیں یہ — بہت دُور چکّر لگاتے ہیں یہ

پڑے اپنے چکّر میں ہیں گھومتے — ترے حکم کے ذوق میں جھومتے

یہ قائم ہیں تیری ہی تقدیر سے — بندھے ہیں بہم سخت زنجیر سے

گھِسے جو کبھی اور نہ ٹوٹے کبھی — نہ اس بند سے کوئی چھوٹے کبھی

رسائی سے ہاتھوں کی برتر ہے وہ — نظر کے بھی قابو سے باہر ہے وہ

نہ سیمیں نہ زریں نہ وہ آہنی — مگر دستِ قدرت سے ہے وہ بنی

کھُلے کب۔ کوئی اُس کو کھولے اگر — اُسے عقل پائے ٹٹولے اگر

وہ زنجیر کیا ہے کشش باہمی
نہ اُس میں خلل ہو نہ بیشی کمی

عجب تو نے باندھی ہے یہ باگڈوز
تُلا سب کا رہتا ہے آپس میں زور

یہ سب لگ رہے ہیں اُسی لاگ پر
لگاتے ہیں چکر اُسی باگ پر

ہر اک کے لئے اک معیّن ہے دور
وہی اک وتیرہ وہی ایک طور

نشہ میں اطاعت کے سب چور ہیں
کہ قانونِ قدرت سے مجبور ہیں

سدا چال کا ایک انداز ہے
نہ کھٹکا نہ آہٹ نہ آواز ہے

کبھی چلتے چلتے بھٹکتے نہیں
طریقہ سے اپنے بھٹکتے نہیں

ہے ان سب کا آئینِ ایجاد ایک
ہنر ایک ہے اور اُستاد ایک

یہ شاخیں ہیں سب ایک ہی اصل کی
بہاریں ہیں کُل ایک ہی فصل کی

ہر اک چیز ذرّہ سے تا آفتاب
بلاشبہ رکھتی ہے یکساں حساب

ہیں ذرّوں میں خورشید کی سی صفات
ہے خورشید بھی ذرّہ کائنات

حقیقت میں ہے یاں دو رنگی کہاں
جہاں ذرّہ ہے اور ذرّہ جہاں

نہیں تیری قدرت سے کچھ یہ بعید
کہ ہو ہر ستارہ جہانِ جدید

نہیں تیرے لطف و کرم سے عجب
کہ ہو اُس جہاں میں بھی مخلوق سب

ہو گرمی بھی سردی بھی برسات بھی
اندھیرا اُجالا بھی دن رات بھی

یہ ندّی یہ نالے سمندر پہاڑ
یہی بیل بوٹے درخت اور جھاڑ

ہوا بھی ہو اور لطفِ باراں بھی ہو
خزاں بھی ہو فصلِ بہاراں بھی ہو

ہو سر پر اسی طور سے آسمان
ہو پاؤں کے نیچے زمیں بھی یہاں
فلک پر ستارے بھی ہوں جلوہ گر
وہاں بھی ہو دورانِ شمس و قمر

ہوں انسان بھی اور حیوان بھی
ہر اک جنس کا ساز و سامان بھی

(۲) خدا کی صنعت

جو چیز خدا نے ہے بنائی
اُس میں ظاہر ہے خوشنمائی
کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا
چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا
روشن چیزیں بنائیں اُس نے
اچھی شکلیں دکھائیں اُس نے
ہر چیز کی ہے ادا نرالی
حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی
ہر چیز ہے ٹھیک ٹھیک لاریب
ہیں اُس کے تمام کام بے عیب
ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں
چھوٹی چڑیاں پھدک رہی ہیں
اُس کی قدرت سے پھول مہکے
پھولوں پہ پرند آ کے چہکے
چڑیوں کے عجیب پر لگائے
اور پھول میں عطر ہیں بسائے
چڑیوں کی ہے بھانت بھانت آواز
پھولوں کا جدا جدا ہے انداز
محلوں میں امیر ہیں بہ آرام
ہے در پہ کھڑا غریب ناکام
ہے کوئی غنی تو کوئی محتاج
بے گھر ہے کوئی کسی کے گھر راج

روزی دونوں کو دی خدا نے
معمور ہیں قدرتی خزانے

تاروں بھری رات کیا بنائی!
دن کو بخشی عجب صفائی!

موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں
ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں

کیا دودھ سی چاندنی ہے چھٹکی!
حیران ہو کر نگاہ ٹھٹکی!

تارے رہے صبح تک نہ وہ چاند
آگے سورج کے ہو گئے ماند

نیلا نیلا اب آسماں ہے
وہ رات کی انجمن کہاں ہے

شام آئی تو اُس نے پردہ ڈالا
پھر صبح نے کر دیا اُجالا

جاڑا۔ گرمی۔ بہار۔ برسات
ہر رُت میں نیا سماں نئی بات

جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا
ہر شخص ہے، دن میں دھوپ کھاتا

سردی سے ہیں ہاتھ پاؤں ٹھرتے
سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے

سرسوں پھولی بسنت آئی
ہولی پھاگن میں رنگ لائی

پھوٹیں نئی کونپلیں شجر میں
اک جوش بھرا ہوا ہے سر میں

جاڑے کی جو رُت پلٹ گئی ہے
دن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے

گرمی نے زمین کو تپایا
بھانے لگا ہر کسی کو سایہ

برسات میں دل میں بادلوں کے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے

رو آئی ہے زور شور کرتی
دامانِ زمین کو کترتی

کس زور سے بہہ رہا ہے نالا
اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا

بل کھا کے ندی نکل گئی ہے
رُخ اپنا اُدھر بدل گئی ہے

دریا ہے رواں پہاڑ کے پاس
بستی ہے بسی اُجاڑ کے پاس

بستی کے اِدھر اُدھر ہے جنگل
جنگل ہی میں ہو رہا ہے منگل

مٹّی سے خدا نے باغ اُگائے
باغوں میں اُسی نے پھل لگائے

میووں سے لدی ہوئی ہے ڈالی
دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی

سبزے سے ہرا بھرا ہے میدان
اونچے اونچے درخت ذی شان

ہم کھیلتے ہیں وہاں کبڈّی
میری ہے کوئی - کوئی پھسڈّی

گائیں بھینسیں عجب بنائیں
کیا دودھ کی ندّیاں بہائیں

پیدا کئے اونٹ بیل گھوڑے
ہر شے کے بنا دئے ہیں جوڑے

روشن آنکھیں بنائیں دو دو
قدرت کی بہار دیکھنے کو

دو ہونٹ دئے کہ مُنہ سے بولیں
شکر اُس کا کریں زبان کھولیں

ہر شے اُس نے بنائی نادِر
بیشک ہے خدا قوی و قادِر

(۳) خطبہ

حمد و سپاس حصہ اُس پاک ذات کا ہے ۔ جو آسرا سہارا کُل کائنات کا ہے
جب کچھ نہ تھا وہی تھا اُس کے سوا نہ تھا کچھ ۔ کچھ ہو نہ ہو وہ ہو گا۔ قدرت ہے اُس کی کیا کچھ
کن خوبیوں سے اُس نے اِس بزم کو سجایا ۔ اور خلعتِ شرافت انسان کو پہنایا
اللہ رے اُس کی قدرت! اللہ رے بےنیازی! ۔ دی بعض کو بہ نسبت بعضوں کے سرفرازی
پھر خاص خاص بندے جو اُس نے چُن لیے ہیں ۔ کیا کیا بلند رتبے اُن کو عطا کیے ہیں
یاں بندگی ہے اور واں بندہ نوازیاں ہیں ۔ یاں سر جُھکا ہوا ہے واں سرفرازیاں ہیں
اِنسان ہی نہ ہوتا جو بندگی نہ ہوتی ۔ اندھیر تھا جو دل میں یہ لَو لگی نہ ہوتی
طاعت کا آدمی کو فرمان کیوں ملا ہے ۔ بے حد وہاں مہیّا اِنعام اور صلہ ہے
ہے اِذن عام لوگو! خوانِ کرم پہ ٹوٹو ۔ بھر بھر کے جھولیاں لو۔ دوڑو ثواب لوٹو
تم بھی نہیں ہو محروم۔ آؤ گناہ گارو! ۔ گر صدقِ دل سے اپنے غفّار کو پکارو
تو پاؤ گے ہمیشہ توبہ کا در کھلا تم ۔ رحمت ہے اُس کی بے حد کرتے ہو فکر کیا تم
ہر وقت باڑھ پر ہے لطف و کرم کا دریا ۔ دو چار ہاتھ مارو۔ لگتا ہے پار کھیوا
پھر اُس کی نعمتیں ہیں اور عیش ہیں جہاں کے ۔ افسوس! جو نہ مانیں گُن ایسے مہرباں کے
میں حمد اُس کی ہر دم کرتا ہوں جان و دل سے ۔ اور شکر ہے ٹپکتا اس میری آب و گل سے
میں اُس کی مغفرت کا ہوں جی سے آرزو مند ۔ توبہ ہے اُس کے آگے۔ توبہ کا در نہیں بند

نوٹ: یہ دونوں خطبے خان بہادر ڈپٹی محمد صدیق صاحب رئیس میرٹھ کی فرمائش سے لکھے گئے تھے جب کہ اُن کا تعلق سرکار نظام سے تھا ۱۲

میں اُس سے چاہتا ہوں دُنیا میں تندرستی
دے اپنی راہ میں وہ میرے قدم کو چُستی

بادل برس پڑے کاش اُس کی عنایتوں کا
اُبلے زمینِ دل سے چشمہ ہدایتوں کا

رہنا گواہ تم بھی دیتا ہوں میں شہادت
ہے پاک ذات اُس کی بس قابلِ عبادت

اُس کے سوا تو کوئی معبود ہی نہیں ہے
ہاں! اُس کے ہوتے کوئی موجود ہی نہیں ہے

یکتا ہے وہ۔ کہاں ہے؟ اُس کا شریک کوئی
میرے ہر ایک دُکھ کی کرتا ہے چارہ جوئی

ہاں! یہ بھی سُن رکھو تم دیتا ہوں میں گواہی
ہادی مرا محمدؐ ہے بندۂ الٰہی

تاجِ رسالت اُس کے سر پر خدا نے رکھا
اوروں سے اُس کو برتر صدق و صفا نے رکھا

اُس کو خدا نے اپنا پیغام بر بنایا
بے کم و کاست اُس نے جو حکم تھا سُنایا

وہ خاتمِ نبوّت وہ سرورِ دو عالم
درگاہِ ایزدی کا تھا اِک سفیرِ اعظم

حلم و وقار و نرمی خوش خوئی مہربانی
پیغمبری کی اُس میں تھی یہ کھُلی نشانی

خطبۂ دوم

لوگو! سُنو کہ کوچ کی ساعت قریب ہے
جو جمع کر لے توشہ وُہی خوش نصیب ہے

جی بندگیِ حق سے چُراتے ہو واہ وا!
حالانکہ دوستی کا بھی کرتے ہو ادّعا

دوزخ سے نفرت اور یہ افعالِ زشت بھی!
گو تنگ تو ایسے اور امیدِ بہشت بھی!

دین کا معاملہ ہو تو گویا ہیں نیم جاں
دنیا کے کاروبار میں یہ جاں فشانیاں

دارالبقا کا بھول گئے اہتمام تم
دارالفنا کو سمجھے ہو اپنا مقام تم

واللہ ہو گئی ہے تمھاری سمجھ خراب
پوچھا گیا وہاں تو بھلا دو گے کیا جواب

افسوس اس سمجھ پہ عجب پُرغرور ہو
موت آ رہی ہے تم ابھی غفلت میں چور ہو

سوتے ہیں زیرِ خاک پڑے کس قدر عزیز
تم اپنے مستِ عیش ہو کرتے نہیں تمیز

چھوٹے بھی اور بڑے بھی جو تم سے تھے چل بسے
کیا سمجھے ہو؟ رہیں گے تمھارے محل بسے

ہیہات اُن کے حال سے عبرت نہیں تمھیں
تحصیل جاہ و مال سے فرصت نہیں تمھیں

قرآں سنو۔ تو ہو تمھیں اس بات پر عبور
اللہ کی طرف ہمیں جانا ہے بالضرور

اللہ کا کلام ہے سب سے بلیغ تر
مالک ہے سب کا۔ ہے اُسے ہر بات کی خبر

قرآنِ پاک کوئی پڑھے تو سنو خموش
اللہ تم پہ رحم کرے ہے وہ عیب پوش

(۴) تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے

بنایا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا
سو ایک ایک تنکا اِکٹھا کیا

گیا ایک ہی بار سورج نہ ڈوب
مگر رفتہ رفتہ ہوا ہے غروب

قدم ہی قدم طے ہوا ہے سفر
گئیں لحظہ لحظہ میں عمریں گذر

سمندر کی لہروں کا تانتا سدا
کنارہ سے ہے آ کے ٹکرا رہا

سمندر سے دریا سے اُٹھتی ہے موج
سدا کرتی رہتی ہے دھاوا یہ فوج

کراروں کو آخر گرا ہی دیا چٹانوں کو بالکل صفاچٹ کیا
برستا جو مینہ موسلا دھار ہے سو یہ ننھی بوندیوں کی بوچھار ہے
درختوں کے جھنڈ اور جنگل گھنے یوہیں پتّے پتّے سے مل کر بنے
ہوئے ریشہ ریشہ سے بن اور جھاڑ بنا ذرّہ ذرّہ سے مل کر پہاڑ
لگا دانہ دانہ سے غلّہ کا ڈھیر بڑا لمحہ لمحہ سے برسوں کا پھیر
جو ایک ایک پل کر کے دن کٹ گیا تو گھڑیوں ہی گھڑیوں برس گھٹ گیا
لکھا لکھنے والے نے ایک ایک حرف ہوئیں گڈیاں کتنی کاغذ کی صرف
ہوئی لکھتے لکھتے مرتّب کتاب اسی پر ہر اک شے کا سمجھو حساب
ہر اک علم و فن اور ہر کرتب ہنر نہ تھا پہلے ہی دن سے اس ڈھنگ پر
یونہیں بڑھتے بڑھتے ترقّی ہوئی جو نیرہ ہے اب تھا وہ پہلے سوئی
جولاہے نے جوڑا تھا ایک ایک تار ہوئے تھان جس کے گزوں سے شمار
یونہیں بھوپیوں بھرے جھیل تال یونہیں کوڑی کوڑی ہوا جمع مال
اگر تھوڑا تھوڑا کرو صبح و شام
بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام

۳۱ مارچ ۱۹۱۵ء
۱ س م

(۵) ایک وقت میں ایک کام

ہے کام کے وقت کام اچھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا

جب کام کا وقت ہو کرو کام
بھولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام

ہاں کھیل کے وقت خوب کھیلو
کودو پھاندو کہ ڈنڈ پیلو

خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ
ہر بات کا سیکھئے سلیقہ

ہمت کو نہ ہاریو خدارا
مت ڈھونڈیو غیر کا سہارا

اپنی ہمت سے کام کرنا
مشکل ہو تو چاہیئے نہ ڈرنا

جو کچھ ہو سو اپنے دم قدم سے
کیا کام ہے غیر کے کرم سے

مت چھوڑیو کام کو ادھورا
بے کار ہے جو ہوا نہ پورا

ہر وقت میں صرف ایک ہی کام
پا سکتا ہے بہتری سے انجام

جب کام میں کام اور چھیڑا
دونوں ہی میں پڑ گیا بکھیڑا

جو وقت گزر گیا اکارت
افسوس ہوا خزانہ غارت

ہے کام کے وقت کام اچھا
اور کھیل کے وقت کھیل زیبا

(۶) ہوا چلی

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی

لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں

پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی
سویا ہوا تھا سبزہ اُسے تو جگا چلی

سرسبز ہوں درخت نہ باغوں میں تجھ بغیر
تیرے ہی دم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر

پڑ جائے اس جہان میں ہوا کی اگر کمی
چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی

چڑیوں کو یہ اُڑان کی طاقت کہاں رہے
پھر کائیں کائیں ہو نہ غٹر غوں نہ چہچہے

بندوں کو چاہیئے کہ کریں بندگی ادا
اس کی کہ جس کے حکم سے چلتی ہے یہ سدا

(۷) پن چکّی

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر
تیرے پہیّہ کو ہے سدا چکّر

پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر
تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اِک ڈھیر

لوگ لیجائیں گے سمیٹ سمیٹ
تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ

بھر کے لاتے ہیں گاڑیوں میں اناج
شہر کے شہر ہیں ترے محتاج

تو بڑے کام کی ہے اے چکّی!
کام کو کر رہی ہے طے چکّی

ختم تیرا سفر نہیں ہوتا
نہیں ہوتا مگر نہیں ہوتا
پانی ہر وقت بہتا ہے ڈھل ڈھل
جو گھماتا ہے آ کے تیری کل
کیا تجھے چین ہی نہیں آتا
کام جب تک نبڑ نہیں جاتا
مینہ برستا ہو یا چلے آندھی
تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی
تو بڑے کام کی ہے لے چکّی!
مجھکو بھاتی ہے تیری لے چکّی
علم سیکھو سبق پڑھو بچّو
اور آگے چلو بڑھو بچّو
کھیلنے کو دنے کا مت لو نام
کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب نبڑ جائے کام تب ہے مزہ
کھیلنے کھانے اور سونے کا
دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ کہ اُکتا کے خامشی کے ساتھ

دیکھ لو چل رہی ہے پن چکّی
دھن کی پوری ہے کام کی پکّی

(۸) اسلم کی بلّی

چھوٹی سی بلّی کو میں کرتا ہوں پیار
صاف ہے ستھری ہے بڑی ہے کِھلار
گود میں لیتا ہوں تو کیا گرم ہے
گالے کی مانند رُواں نرم ہے
میں جو نہ چھیڑوں تو نہ جھلّائے وہ
میں نہ ستاؤں تو نہ غُرّائے وہ
کھینچ کے دُم اب نہ ستاؤں گا میں
گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں

اب نہ ڈرے گی وہ مری مار سے
کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے
صحن میں گھر میں کبھی میدان میں
کھیلیں گے در میں کبھی دالان میں
دُم کو ہلا میرے پڑے گی وہ پاؤں
بولے گی پھر پیار سے یوں "میاؤں میاؤں"
دونگا اُسے گیند میں جب آن کر
جھپٹے گی وہ اُس پہ چوہا جان کر
تاک لگائے گی۔ دبوچے گی خوب
مار نہٹّے اُسے نوچے گی خوب

ہم نے بڑے پیار سے پالا اِسے
کہتے ہیں سب چوہوں کی خالا اِسے

(۹) بچّہ اور ماں

اچھّی امّاں! مجھے بتا دو ابھی
کیوں ہے بچّہ کی ماما اتنی؟
تم کو بچّہ سے کیوں یہ اُلفت ہے؟
کس لئے اِس قدر محبت ہے؟
ماں نے بچّہ کو یوں جواب دیا
حیف! تم جانتے نہیں بیٹا
کیسا لیٹا ہے یہ خوش و خُرّم
نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی غم
نہ تو روتا نہ بلبلاتا ہے
گود میں کیا ہُمک کے آتا ہے
مسکراتا ہے کیا ہی خوش ہو کر
جیسے چڑیا مگن ہو ڈالی پر
جبکہ سونے کا وقت ہے آتا
میرے سینہ سے ہے چمٹ جاتا
جب کہ آنکھوں میں نیند آتی ہے
بستر اُس کا میری چھاتی ہے

نیند لے کر ہنسی خوشی سے اُٹھا — پھول گویا کھِلا چنبیلی کا
لگ گئی بھوک کہہ نہیں سکتا — پیاری نظروں سے ہے مجھے تکتا

پیار کا میرے بس یہی ہے سبب
نہیں آتا بیان میں مطلب

(۱۰) ماں اور بچّہ

بولی بچّہ سے ماں مرے پیارے — صدقے امّاں! جواب دو بارے
کہہ بچّہ کو ماں سے الفت کیوں؟ — رکھتا ہے اس قدر محبّت کیوں؟
دیا بچّے نے یوں جواب سُنو! — اے ہے! امّاں خبر نہیں تم کو
مجھکو تکلیف سے بچاتی ہو — پیار سے گود میں بٹھاتی ہو
جی مرا بدمزہ اگر ہو جائے — میرے دُکھ کا تمھیں اثر ہو جائے
مجھکو ہو درد تم کو حیرانی — چھُپکے چھُپکے کرو نگہبانی
اچھّے اچھّے کھِلاتی ہو کھانے — پیار کرتی ہو تم۔ خدا جانے!
اور سب سے کہ آرہے ہیں نظر — تم زیادہ ہو مہرباں مجھ پر
جانتا ہوں عزیز سب سے تمھیں — چاہتا ہوں اسی سبب سے تمھیں

پیاری امّاں کہا نہیں جاتا
نہیں مطلب بیان میں آتا

(۱۱) ایک مور اور کلنگ

دُم مور نے پھول کر دکھائی
اور بولا کلنگ سے کہ بھائی!

کیا خوب ہیں نقش! اور کیا رنگ!
دُنیا مجھے دیکھ کر ہوئی دنگ

میری سی کہاں ہے آپ کی دم
کر سکتے نہیں مقابلہ تم

بولا اُس سے کلنگ ہنس کر
ہاں! آپ کے لاجواب ہیں پر

لیکن نہیں کچھ بھی کام آتے
بچّوں ہی کے دل کو ہیں لبھاتے

اُڑنے نہیں دیتی دم تمھاری
لیتے ہیں پکڑ تمھیں شکاری

یہ کہہ کے پروں کو پھڑپھڑا کے
بولا! اونچا ہوا پہ جا کے

آؤ! کریں آسماں کا پھیرا
کچھ دم ہے تو ساتھ دو نہ میرا

مُنہ اپنا سا لے کے رہ گیا مور
تھا اُس میں کہاں اُڑان کا زور

بھاتا ہے جنھیں نرا دکھاوا
وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا

بس اُن کو ہے ٹیپ ٹاپ کی دُھن
شیخی کے سوا نہیں کوئی گُن

دیکھیں کسے یاد ہے زبانی
مور اور کُلنگ کی کہانی



(۱۲) عجیب چڑیا

چڑیا ہم نے عجیب پالی — زنجیر اُس کے گلے میں ڈالی
دن رات ہو۔ شام یا سویرا — لیتی ہے وہ جیب میں بسیرا
چڑیا سے بھی قد ہے اُس کا چھوٹا — ہے اُس کا بدن تمام پوٹا
پوٹے پہ جو غور سے نظر کی — پوٹا نہیں پوٹ ہے ہنر کی
گویا ہے۔ اگرچہ بے زبان ہے — ناداں ہے مگر حساب داں ہے
دانہ پانی نہیں وہ کھاتی — ہر دم ہے خوشی سے چہچہاتی
دن رات میں چھیڑ دو کسی آن — یہ چھیڑ ہے اُس کے جسم کی جان
جب تک جیتی ہے جاگتی ہے — لو کام تو چیز کام کی ہے
کہتی ہے کہ وقت کی خبر لو — جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو
غفلت کیجے تو ٹوکتی ہے — عُجلت کیجے تو روکتی ہے
اِس طور سے کرتی ہے گزارہ — انڈے دیتی ہے دن میں بارہ
پھر اِتنے ہی رات کو ہے دیتی — دیتے ہی ہر ایک کو ہے سیتی
انڈے ہیں تمام اُس کے سچے — ایک ایک سے نکلے ساٹھ بچے
ہر بچہ نے اُگلے ساٹھ دانے — ہر دانہ میں ہیں بھرے خزانے
جو دانہ گرا سو ہو گیا گم — ڈھونڈا کرو پھر نہ پاؤ گے تم

دانہ کی بتاؤں کیا میں قیمت　　دانا سمجھیں اُسے غنیمت

جس نے اُسے پا لیا کہا واہ!　　کیا بات ہے تیری بارک اللہ!

سچ مچ تو لعلِ بے بہا ہے　　گویا ہر درد کی دوا ہے

القصّہ ہے وہ عجب پرندہ

مُردہ اُسے کہہ سکیں نہ زندہ

(۱۳) ایک لڑکا اور بیر

ایک لڑکا ہے بڑا ایمان دار　　آزمائش ہو چکی ہے چند بار

ایک دن وہ نیک دل اور باحیا　　اپنے ہمسایہ کے گھر میں جا گیا

آدمی بالکل نہیں واں نام کو　　کیونکہ ہمسایہ گیا ہے کام کو

تازہ تازہ بیر ڈلیا میں بھرے　　بے حفاظت گھر کے اندر میں دھرے

لیکن اُس نے بیر کو چھیڑا نہیں　　ہو نہ جائے شبہ چوری کا کہیں

آگیا اتنے میں ہمسایہ وہاں　　کھیل میں مصروف ہے لڑکا جہاں

اپنے بیروں میں نہ پائی کچھ کمی　　ہو کے خوش لڑکے سے بولا آدمی

بیر یہ تم نے چرائے کیوں نہیں؟　　کیوں چُراتا؟ چور تھا کیا میں کہیں؟

چور جب بنتے کہ کوئی دیکھتا　　دیکھنے کو میں ہی خود موجود تھا

کچھ بُرائی آپ میں گر پاؤں میں　　پانی پانی شرم سے ہو جاؤں میں

واہ وا! شاباش! لڑکے واہ وا!
تو جواں مردوں سے بازی لے گیا

(۱۴) ایک پودا اور گھاس

اتفاقاً ایک پودا اور گھاس
باغ میں دونوں کھڑے ہیں پاس پاس

گھاس کہتی ہے کہ اے میرے رفیق
کیا انوکھا اس جہاں کا ہے طریق

ہے ہماری اور تمہاری ایک ذات
ایک قدرت سے ہے دونوں کی حیات

مٹی اور پانی ہوا اور روشنی
واسطے دونوں کے یکساں ہے بنی

تجھ پہ لیکن ہے عنایت کی نظر
پھینک دیتے ہیں مجھے جڑ کھود کر

سر اٹھانے کی مجھے فرصت نہیں
اور ہوا کھانے کی بھی رخصت نہیں

کون دیتا ہے مجھے یاں پھیلنے
کھا لیا گھوڑے گدھے یا بیل نے

تجھ پہ منہ ڈالے جو کوئی جانور
اس کی لی جاتی ہے ڈنڈی سے خبر

اولے پالے سے بچاتے ہیں تجھے
کیا ہی عزت سے بڑھاتے ہیں تجھے

چاہتے ہیں تجھ کو سب کرتے ہیں پیار
کچھ پتا اس کا بتا اے دوستدار

اس سے پودے نے کہا یوں سر ہلا
گھاس! سب بیجا ہے یہ تیرا گلا

مجھ میں اور تجھ میں نہیں کچھ بھی تمیز
صرف سایہ اور میوہ ہے عزیز

فائدہ اک روز مجھ سے پائیں گے
سایہ میں بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے

ہے یہاں عزّت کا سہرا اُس کے سر
جس سے پہونچے نفع سب کو بیشتر

(۱۵) ایک جگنو اور بچّہ کی باتیں

سُناؤں تمھیں بات اک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی

چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں
ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

پڑی ایک بچّہ کی اُن پر نظر
پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر

چمک دار کیڑا جو بھایا اُسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اُسے

وہ جھم جھم چمکتا اِدھر سے اُدھر
پھرا۔ کوئی رستہ نہ پایا مگر

تو غمگین قیدی نے کی التجا
کہ چھوٹے شکاری! مجھے کر رہا

جگنو

خدا کے لئے چھوڑ دے چھوڑ دے!
مِری قید کے جال کو توڑ دے!

بچّہ

کروں گا نہ آزاد اُس وقت تک
کہ میں دیکھ لوں دن میں تیری چمک

جگنو

چمک میری دن میں نہ دیکھو گے تم
اُجالے میں ہو جائے گی وہ تو گم

بچّہ

ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے | کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اُجالے میں دن کے کُھلے گا یہ حال | کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال
دھواں ہے نہ شعلہ نہ گرمی نہ آنچ | چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ

جگنو

یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب | کہ ذرّہ کو چمکائے جوں آفتاب
مجھے دی ہے اس واسطے یہ چمک | کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹک
نہ اَلّڑھ پنے سے کرو پائمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال!

(۱۶) ایک گھوڑا اور اُس کا سایہ

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار | اپنے سایہ سے بدکتا بار بار
اُس سے مالک نے خفا ہو کر کہا | سُن تو احمق! جس سے تو ہے ڈر رہا
جسم کا تیرے ہی تو سایہ ہے وہ | کچھ درندہ ہے نہ چوپایہ ہے وہ
جسم رکھتا ہے نہ اُس کے جان ہے | تو بڑا ڈرپوک۔ او نادان! ہے
یوں دیا گھوڑے نے مالک کو جواب | سچ کہا یہ آپ نے لیکن جناب!
آدمی سے بڑھ کے میں وہمی نہیں | اَن ہوئی باتوں کا ہے جس کو یقیں
بھوت کا قصہ کہانی کے سوا | کچھ نشاں گھر میں نہ جنگل میں پتا

بھوت سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے
کیا ہی وہمی آدمی کی ذات ہے
سایہ تو آنکھوں سے آتا ہے نظر
کیا عجب ہے جو ہوا مجھ پر اثر

اپنے دکھ کا کیجیے اوّل علاج
دوسروں کا پوچھیے پیچھے مزاج

(۱۷) ایک کتّا اور اُس کی پرچھائیں

مُنہ میں ٹکڑا لیے ہوئے کُتّا
ایک دریا کو تیر کر اُترا
پانی آئینہ سا رہا تھا چمک
نظر آتی تھی تہ کی مٹّی تک
اپنی پرچھائیں پر کیا جو غور
اُس کو سمجھا کہ ہے یہ کُتّا اور
مُنہ میں ٹکڑا دبا رہا ہے یہ
گہرے پانی میں جا رہا ہے یہ
حرص نے ایسا بے قرار کیا
جھٹ سے غرّا کے اُس پہ وار کیا
جونہیں ٹکڑے پہ اُس کے مُنہ مارا
اپنا ٹکڑا بھی کھو دیا سارا
واں نہ ٹکڑا نہ اور کُتّا تھا
وہم تھا۔ وہم کے سوا کیا تھا
یونہیں جتنے ہیں لالچی نادان
کر کے لالچ اُٹھاتے ہیں نقصان
باندھتے ہیں کہاں کہاں کے خیال
اور کھو بیٹھتے ہیں اپنا مال

تم ہوس میں سڑی نہ بن جاؤ
جو ملے اُس کو کام میں لاؤ

(۱۸) ریل گاڑی

حیواں ہے وہ نہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے
سینہ میں اُس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے

کھا پی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھوئیں اُڑا کر غصہ اُتارتی ہے

وہ گھورتی گرجتی بھرتی ہے اک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اُس نے کاٹا

آتی ہے شور کرتی جاتی ہے غل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی

بے خوف بے محابا ہر دم رواں دواں ہے
ہاتھی بھی اُس کے آگے اِک مورِ ناتواں ہے

آندھی ہو یا اندھیرا ہے اُس کو سب برابر
یکساں ہے نور و ظلمت اور روز و شب برابر

اُتّر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک
سب ایک کر دیا ہے پہنچی ہے وہ جہاں تک

بجلی ہے یا بگولا- بھونچال ہے کہ آندھی
ٹھیکہ پہ ہے پہونچتی بچنوں کی ہے وہ باندھی

ہر آن ہے سفر میں کم ہے قیام کرتی
رہتی نہیں معطّل- پھرتی ہے کام کرتی

پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہونچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اُس نے سوداگری کے تن میں

ہر چیز سے نرالی ہے چال ڈھال اُس کی
پاؤ گے صنعتوں میں کمتر مثال اُس کی

برکت سے اُس کی بے پر پردار بن گئے ہیں
ملک اُس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں

ہم کہہ چکے مفصّل- جو کچھ ہے کام اُس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اُس کا

جی ہاں سمجھ گیا میں- پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرہ سے آتی ہے ریل گاڑی

(۱۹) ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اُس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

خاک کو اُس نے سبزہ بنایا
سبزہ کو پھر گائے نے کھایا

کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں

سبحان اللہ دودھ ہے کیسا
تازہ گرم سفید اور میٹھا

دودھ میں بھیگی روٹی میری
اُس کے کرم نے بخشی سیری

دودھ دہی اور مٹّھا مسکا
دے نہ خدا تو کس کے بس کا

گائے کو دی کیا اچھّی صورت
خوبی کی ہے گویا مورت

دانہ دُنکا بھوسی چوکر
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر

کھا کر تنکے اور ٹھیٹرے
دودھ ہے دیتی شام سویرے

کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی جنگل کو سدھاری

سبزہ سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے

پانی موجیں مار رہا ہے
چرواہا چمکار رہا ہے

پانی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر

دوری میں جو دن ہے کاٹا
بچّہ کو کس پیار سے چاٹا

گائے ہمارے حق میں ہے نعمت ‏ دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اُس کے بیل بنائے ‏ جو کھیتی کے کام میں آئے
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ایسی گائے بنائی

(۲۰) سچ کہو

سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ ‏ ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ
سچ کہو گے تو تم رہو گے عزیز ‏ سچ تو یہ ہے کہ سچ ہے اچھی چیز
سچ کہو گے تو تم رہو گے شاد ‏ فکر سے پاک رنج سے آزاد
سچ کہو گے تو تم رہو گے دلیر ‏ جیسے ڈرتا نہیں دلاور شیر
سچ سے رہتی ہے تقویت دل کو ‏ سہل کرتا ہے سخت مشکل کو
سچ ہے ساری معاملوں کی جان ‏ سچ سے رہتا ہے دل کو اطمینان
سچ میں راحت ہے اور آسانی ‏ سچ سے ہوتی نہیں پشیمانی
سچ ہے دنیا میں نیکیوں کی جڑ ‏ سچ نہ ہو تو جہان جائے اُجڑ
سچ کہو گے تو دل رہے گا صاف ‏ سچ کرا دے گا سب قصور معاف
سچ سے زنہار درگزر نہ کرو ‏ دل میں کچھ خوف اور خطر نہ کرو
جس کو سچ بولنے کی عادت ہے ‏ وہ بڑا نیک باسعادت ہے

وہی دانا ہے جو کہ ہے سچّا
اس میں بڈّھا ہو یا کوئی بچّا
ہے بُرا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا مُنہ کالا
فائدہ اُس کو کچھ نہ دے گا جھوٹ
جائے گا ایک روز بھانڈا پھوٹ

جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو
جھوٹ ذلّت کی بات ہے اَخ تھو!!

(۲۱) ہمارا کُتّا ٹیپو

ٹیپو ہے اس کا نام یہ کُتّا عجیب ہے
بڈّھا ہے با ادب ہے نہایت غریب ہے
ہم دونوں بھائی بہنوں سے الفت ہے اس قدر
جب دیکھتا ہے دور سے آتا ہے دوڑ کر
افسوس میرے ٹیپو! حیراں ہوں کیا کروں
کس ڈھب سے تیرے ساتھ محبّت کیا کروں
آتا ہے کم جہاں میں تجھسا رفیق ہاتھ
جاتا ہوں جب میں سیر کو رہتا ہے میری ساتھ
میں دودھ پی رہا ہوں تو بیٹھا ہے میرے پاس
کچھ شک نہیں کہ تو ہے وفادار حق شناس
البتہ میں بھی کرتا ہوں صرف اس قدر سلوک
دیتا ہوں ایک ٹکڑا کہ دب جائے تیری بھوک
لیکن مجھے یقیں ہے اگر کچھ نہ دوں تجھے
دیکھے گا پھر بھی پیار کی نظروں سے تو مجھے
اس واسطے کہ تو ہے وفادار حق شناس
مالک کا اپنے تجھ کو بہت ہے لحاظ و پاس
ٹیپو ہمارے گھر کا پُرانا رفیق ہے
بڈّھا ہے باوفا ہے نہایت شفیق ہے
جنگل کو جائیں ڈھور تو جاتا ہے ساتھ ساتھ
جب گھر کو واپس آئیں تو آتا ہے ساتھ ساتھ

بیچارہ گھر کی چوکسی کرتا ہے رات بھر
اور دن میں کھیلتا ہے مرے ساتھ ادھر اُدھر

شفق (۲۲)

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ
جنھیں دیکھکر عقل ہوتی ہے دنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے
ہر ایک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ
سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی
نیفشی و نارنجی و چمپئی
یہ کیا بھید ہے! کیا کرامات ہے!
ہر اک رنگ میں اک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ
بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اُس میں سرخی کی لاگ
ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ
اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھٹے لال بانات کے



(۲۳) رات

گیا دن ہوئی شام آئی ہے رات
خدا نے عجب شے بنائی ہے رات

نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا
اُٹھائے مزہ دن کا انسان کیا

ہوئی رات خلقت چھٹی کام سے
خموشی سی چھائی سرِ شام سے

لگے ہونے اب ہاٹ بازار بند
زمانے کے سب کاروبار بند

مسافر نے دن بھر کیا ہے سفر
سرِ شام منزل پہ کھولی کمر

درختوں کے پتّے بھی چپ ہو گئے
ہوا تھم گئی پیڑ بھی سو گئے

اندھیرا اُجالے پہ غالب ہوا
ہر اک شخص راحت کا طالب ہوا

ہوئے روشن آبادیوں میں چراغ
ہوا سب کو محنت سے حاصل فراغ

کسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر
کہ گھر میں کرے چین سے شب بسر

تھپک کر سلایا اُسے نیند نے
تردد بھلایا اُسے نیند نے

غریب آدمی جو کہ مزدور ہیں
مشقّت سے جن کے بدن چور ہیں

وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے
وہ ماندے تھکے اور ہارے ہوئے

نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر
ہوئے بال بچّے بھی خوش دیکھ کر

گئے بھول سب کام دھندے کا غم
سویرے کو اُٹھّیں گے اب تازہ دم

کہاں چین یہ بادشہ کو نصیب
کہ جس بےغمی سے ہیں سوتے غریب

(۲۴) گرمی کا موسم

مئی کا آن پہونچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا

بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا
ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایا

چلی لُو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ
لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ

زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے
کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے

در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے
بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے

پرندے اُڑ کے ہیں پانی پہ گرتے
چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے

درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں
مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں

نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی

نہ پنکھا ہے نہ ٹٹّی ہے نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

(۲۵) برسات

وہ دیکھو اُٹھی کالی کالی گھٹا
ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا

گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی
ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی

گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹّی میں جان آ گئی

زمیں سبزے سے لہلہانے لگی
کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی

جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل
عجب بیل پتّے عجب پھول پھل

ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے
ہر اک پھول کا ایک نیا رنگ ہے

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا
وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا

ہزاروں پھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹّی کے پر

(۲۶) ملمّع کی انگوٹھی

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
اوچھی تھی لگی بولنے اترا کے بڑا بول

چاندی کی انگوٹھی کے نہیں ساتھ رہوں گی
وہ اور ہے میں اور یہ ذلّت نہ سہوں گی

میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانا
وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اُس کا ٹھکانا

میری سی چمک اِس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی ہی کہ ہے رانگ مجھی اس میں بھی شک ہے

میری سی کہاں چاشنی میرا سا کہاں رنگ
وہ مول میں اور تول میں میرے نہیں پاسنگ

اے دیکھنے والو تمھیں انصاف سے کہنا
چاندی کی انگوٹھی بھی ہے کچھ گہنوں میں گہنا

یہ سنتے ہی چاندی کی انگوٹھی بھی گئی جل
اللہ ری ملمّع کی انگوٹھی ترے چھل بل

سونے کے ملمّع پہ نہ اترا میری پیاری
دو دن میں بھڑک اس کی اُتر جائیگی ساری

کچھ دیر حقیقت کو چھپایا بھی تو پھر کیا
جھوٹوں نے جو سچوں کو چڑایا بھی تو پھر کیا

مت بھول کبھی اصل کو اپنی ری احمق!
جب تاؤ دیا جائے گا ہو جائے گا مُنہ فق

سچے کی تو عزّت ہی بڑھے گی جو کریں جانچ
مشہور مثل ہے کہ نہیں سانچ کو کچھ آنچ

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا
چھوٹے کو بڑا بن کے اُبھرنا نہیں اچھا

(۲۷) دال کی فریاد

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال
دال کرتی ہے عرض یوں احوال

ایک دن تھا ہری بھری تھی میں
ساری آفات سے بری تھی میں

تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ
وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا

پانی پی پی کے تھی میں لہراتی
دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی

مینہ برستا تھا جھوکے آتے تھے
گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے

یہی سورج زمین تھے ماں باوا
مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا

جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا
آہ ظالم کسان آن پڑا

گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ
کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ

خوب لوٹا دھڑی دھڑی کر کے
مجھ کو گونوں میں لے گئے بھر کے

ہوگئی دم کی دم میں بربادی
چھن گئی ہائے میری آزادی!

کیا بتاؤں کہاں کہاں کھینچا
دال منڈی میں مجھکو جا بیچا

ایک ظالم سے واں پڑا پالا
جس نے چکی میں مجھ کو دل ڈالا

ہوا تقدیر کا لکھا پورا
دونوں پاٹوں نے کر دیا چورا

نہ سنی میری آہ اور رازی
خوب بنئے نے کی خریداری

چھانا چھلنی میں چھاج میں پھٹکا
قید خانہ میرا بنا مٹکا

پھر مقدّر مجھے یہاں لایا
تم نے تو اور بھی غضب ڈھایا

کھال کھینچی الگ کیے چھلکے
زخم کیونکر ہرے نہ ہوں دل کے

ڈالیں مرچیں نمک لگایا خوب
رکھ کے چولھے پہ جی جلایا خوب

اُس پہ کفگیر کے ٹھوکے ہیں
اور ناخن کے بھی کچوکے ہیں

میرے گلنے کی لے رہی ہو خبر
دانت ہے آپ کا مرے اوپر

گرم گھی کر کے مجھکو داغ دیا
ہائے تم نے بھی کچھ نہ رحم کیا

ہاتھ دھو کر پڑی ہو پیچھے تم
جان پر آبنی حواس ہیں گم

اچھی بی بی تمھیں کرو انصاف
ظلم ہے یا نہیں (قصور معاف)

کہا لڑکی نے میری پیاری دال
مجھکو معلوم ہے ترا سب حال

تو اگر کھیت سے نہیں آتی
خاک میں ملکے خاک ہوجاتی

یا کوئی گائے بھینس چر لیتی
پیٹ میں اپنے تجھکو بھر لیتی

میں تو رتبہ ترا بڑھاتی ہوں
اب چپاتی سے تجھکو کھاتی ہوں

نہ ستانا نہ جی جلانا تھا
یوں سمجھے آدمی بنانا تھا

اگلی بیتی کا تو نہ کر کچھ غم
مہربانی تھی سب نہ تھا یہ ستم

(۲۸) دال چپاتی

اور سنو ایک حکایت نئی
دال چپاتی میں جھڑپ ہوگئی

دال لگی کہنے کہ میرا مزہ — کرتا چپاتی کو بھی ہے بامزہ
میرے بدوں اِس کو بھلا کھائے کون — روکھی چپاتی میں مزہ پائے کون
بلکہ بڑی دال اگر کھائیے — ہونٹ ہی بس چاٹتے رہ جائیے
کرتا ہے درویش جو روٹی طلب — دال چپاتی اُسے دیتے ہیں سب
دیکھ لو اُس وقت میری برتری — نیچے ہے وہ اور میں اوپر دھری
بیٹھتی ہوں چڑھکے چپاتی پہ میں — مونگ دلا کرتی ہوں چھاتی پہ میں
اِس کے سوا دیکھئے میرا سنگار — پہلے مصالح ہے پھر اُس پر بگھار
مجکو پکاتے ہیں سبھی ادبدا — کھاتے ہیں سب شاہ سے لے تا گدا
میری فضیلت میں نہیں کوئی شک — واہ رے میں اور مرا آب و نمک
ذائقہ خوشبو پہ مری لوٹ ہے — دل پہ چپاتی کے یہی چوٹ ہے
دال نے شیخی جو بگھاری بڑی — سُن کے چپاتی بھی اُچھل ہی پڑی
بے ادبی کر نہ میری شان میں — میری طفیلی ہے تو ہر خوان میں
دال ہو سالن ہو کہ چٹنی اچار — سب ہیں میرے ساتھ کے خدمت گزار
کوفتہ ہو قورمہ ہو یا کباب — تھام کے چلتے ہیں یہ میری رکاب
چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ — دال کو پھر کون لگاتا ہے ہاتھ
دال کا دانہ بھی نہ چکھے کوئی — بلکہ رکابی میں نہ رکھے کوئی
دال تو اِک ہارے کا ہتیار ہے — کھائے وہی اِس کو جو بیمار ہے

دال میسّر نہیں ہوتی جنھیں　　صرف چپاتی کو غنیمت گنیں
جس کی فقط دال پہ گزران ہے　　آدمی کا ہے کو وہ حیوان ہے
یوں تو سبھی کھانوں میں افضل ہوں میں　　دال سے سو مرتبہ اول ہوں میں
دونوں میں القصّہ بہت بڑھ گئی　　ایک پہ ایک آن کے پھر چڑھ گئی
لُقمہ بنا دونوں کو میں کھا گیا
قصّہ ہوا فیصلہ جھگڑا گیا

(۲۹) دو مکّھیاں

ایک مکّھی کہ ہے بڑی احمق　　فکرِ انجام اُسے نہیں مطلق
کوتہ اندیش۔ لالچی۔ ناداں　　دیتی پھرتی ہے مفت اپنی جاں
گِری شیرہ پہ حرص کے مارے　　پاؤں اور پَر لتھڑ گئے سارے
آنکھ اُس کی ہیئے کی پھوٹ گئی　　اُکھڑے بازو تو ٹانگ ٹوٹ گئی
آخرش پھنس کے رہ گئی مکّھی　　کیا حماقت کی چاشنی چکّھی
ایک مکّھی ہے سخت دور اندیش　　سوچ لیتی ہے کام کا بس و پیش
اس پہ غالب نہیں ہوسناکی　　اُڑتی پھرتی ہے وہ بہ چالاکی
کہیں مصری کی جب ڈلی پائی　　تو بہ آہستگی اُتر آئی
گرچہ اِس کام میں لگی کچھ دیر　　چاٹ کر ہو گئی مگر وہ سیر

چاٹ کے کھا کے اُڑ گئی پھر پھر
دور بینی کا اُس کو یاد ہے گُر

کس مزے سے گزارتی ہے دن
شکر کا گیت گاتی ہے بھن بھن

(۳۰) مثنوی آبِ زلال

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز
ذرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز

دکھاؤ کچھ طبیعت کی روانی
جو دانا ہو تو سمجھو کیا ہے پانی

یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے
گرہ کھل جائے تو فوراً ہوا ہے

نظر ڈھونڈے مگر کچھ بھی نہ پائے
زباں چکھے مزہ ہرگز نہ آئے

ہواؤں میں لگایا خوب پھندا
انوکھا ہے تیری قدرت کا دھندا

نہیں مشکل اگر تیری رضا ہو
ہوا پانی ہو اور پانی ہوا ہو

مزاج اُس کو دیا ہے نرم کیسا
جگہ جیسی ملے بنجائے ویسا

نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت
طبیعت میں رسائی ہے نہایت

نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ
ہر اک سانچہ میں ڈھلجاتا ہے جھٹ پٹ

نہ ہو صدمہ سے ہرگز ریزہ ریزہ
نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ

نہ اُس کو تیر سے تلوار سے خوف
نہ اُس کو توپ کی بھرمار سے خوف

تواضع سے سدا پستی میں بہنا
جفا سہنا مگر ہموار رہنا

نہیں ہے سرکشی سے کچھ سروکار — نہ دیکھو گے کبھی تم اُس کا انبار
خزانہ گر بلندی پر نہ ہوتا — تو فوّارہ سے وہ باہر نہ ہوتا
جو ہلکا ہو اُسے سر پر اُٹھائے — جو بھاری ہو اُسے غوطا کھلائے
نہ جلتا ہے نہ گلتا ہے نہ سڑتا — نرا پانی نہیں ہرگز بگڑتا
اُسے بھینچو دباؤ یا ٹٹولو — اُسے چھیڑو اچھالو یا گھنگولو
اُسے رگڑو گھسو پیسو بہاؤ — جھکولے دو مسل ڈالو دباؤ
کسی عنوان سے ہو گا نہ نابود — وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ
لگے گرمی تو اُڑ جائے ہوا پر — پڑے سردی تو بنجاتا ہے پتھر
ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے — کبھی اوپر سے بادل بن کے برسے
ہوا پر چڑھ کے پہونچے سیکڑوں کوس — کبھی اولا کبھی پالا کبھی اوس
کہُر ہے بھاپ ہے پانی ہے یا برف — کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف
اُسی کے دم سے دنیا میں تری ہے — اُسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے
پھلوں میں پھول میں ہر پنکھڑی میں — ہر اک ٹہنی میں ہر بوٹی جڑی میں
ہر اک ریشہ میں ہے اُس کی رسائی — غذا ہے جڑ سے کونپل تک پہنچائی
پھلوں کا ہے اُسی سے تازہ چہرہ — اُسی کے سر پہ ہے پھولوں کا سہرہ
اُسی کو پی کے جیتے ہیں سب انساں — اُسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں
یہی معدہ کو پہنچاتا رسد ہے — یہی تحلیل میں کرتا مدد ہے

عمارت کا بسایا اس نے کھیڑا تجارت کا کیا ہے پار بیڑا
زراعت اس کی موروثی اثامی صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی
کہیں ساگر کہیں کھاڑی کہیں جھیل کہیں جمنا کہیں گنگا کہیں نیل
کہیں نالہ کہیں ندی کہیں سیل ہے یہ دنیا کی کمسریٹ کا جرنیل
یہی پہلے زمیں پر موجزن تھا نہ میداں تھا نہ پربت تھا نہ بن تھا
زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر
زمیں پوشیدہ تھی اسکی بغل میں نہ تھا کچھ فرق جل میں اور تھل میں
نہ بستی تھی نہ ٹاپو تھا کہیں پر اسی کا دور دورہ تھا زمیں پر
نہ افریقہ نہ امریکہ نہ یورپ رہی تھی ایشیا اوشنیا چھپ
ہمالہ نے بھی تھی ڈبکی لگائی نہ دیتی تھی کہیں چوٹی دکھائی
نہ طارس تھا نہ بندھیاچل نہ البطین نہ فارس تھا نہ ہندوستان نہ چین
مگر دنیا میں یکسانی کہاں ہے جواب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے
یہاں ہر چیز ہے کروٹ بدلتی ہر ایک حالت ہے چڑھتی اور ڈھلتی
کوئی شے ہو ہوا ہو یا ہو پانی سبھی کو ہے بڑھاپا اور جوانی
رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا اسے خشکی نے پستی میں دھکیلا
زمیں آہستہ آہستہ گئی چوس چھپائے مال کو جس طرح کنجوس
تری کا جب کہ دامن ہو گیا چاک تو خشکی نے اڑائی جا بجا خاک

پہاڑ ابھرے ہوئے میدان پیدا
ہوئے میداں میں نخلستان پیدا

تری کا گو ابھی پلّہ ہے بھاری
اڑائی ہے مگر دونوں میں جاری

کیا کرتے ہیں دونوں کاٹ اور چھانٹ
چلی جاتی ہے باہم لاگ اور ڈانٹ

تری ہر دم چلی جاتی ہے اٹتی
کبھی خشکی بھی ہے کایا پلٹتی

تری کا تین چوتھائی میں ہے راج
تو خشکی ایک چوتھائی میں ہے آج

نہیں چلتی تری کی سینہ زوری
زمیں اک روز رہجائے گی کوری

پہن رکھا تھا جب آبی لبادہ
مٹا پا بھی زمیں کا تھا زیادہ

مگراب دن بدن چڑھتی ہے خشکی
تری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی

کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ
بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

(۲۱) موعظت

کرے دشمنی کوئی تم سے اگر
جہاں تک بنے تم کرو درگزر

کرو تم نہ حاسد کی باتوں پہ غور
جلے جو کوئی - اُس کو جلنے دو اور

اگر تم سے ہو جائے سرزد قصور
تو اقرار و توبہ کرو بالضرور

بدی کی ہو جس نے تمھارے خلاف
جو چاہے معافی - تو کردو معاف

نہیں بلکہ تم اور احساں کرو
بھلائی سے اُس کو پشیماں کرو

ہے شرمندگی اُس کے دل کا علاج
سزا اور ملامت کی کیا احتیاج

بھلائی کرو تو کرو بے غرض
غرض کی بھلائی تو ہے اک مرض

جو محتاج مانگے تو دو تم اُدھار
رہو واپسی کے نہ امیدوار

جو تم کو خدا نے دیا ہے تو دو
نہ خسّت کرو اس میں جو ہو سو ہو

(۳۲) داناؤں کی نصیحت دل سے سُنو

راوی نے ہے اس طرح خبر دی
اک شب لگی بندروں کو سردی

سردی نے دیا جو سخت آزار
جویا ہوئے آگ کے وہ ناچار

ہر چار طرف دوا دوش کی
پائی نہ کہیں دوا خلش کی

ناگہ چمکا جو کرمِ شب تاب
اخگر اُسے جان کر لیا داب

ناچے کودے خوشی سے باہم
تنکے پتّے کئے فراہم

رکھکر اُسے خار و خس کے اندر
پھونکیں لگے مارنے وہ بندر

لیکن ہوا فائدہ نہ کچھ بھی
اُٹھا نہ دھواں نہ آگ سلگی

کرتے رہے پھر بھی کام اپنا
چھوڑا نہ خیالِ خام اپنا

صحرا میں جو اور جانور تھے
وہ تجربہ کار و باخبر تھے

سمجھانے لگے ز روئے شفقت
یوں وقت کو رائیگاں کرو مت

اِس کام سے کیجئے کنارہ
جگنو کو نہ جانئے شرارہ

سمجھانے سے وہ مگر نہ سمجھے
جب تک نہ ہوئی سحر نہ سمجھے

یاروں نے کہی تھی بات ڈھب کی
غُرّا کے اُٹھیں دکھائی بھبکی

ناداں رہے رات بھر اکڑتے
سر مارتے ایڑیاں رگڑتے

جب صبح ہوئی تو شک ہوا دور
شرمندہ ہوئے بہت وہ مغرور

سُن لو نہ سُنے گا جو نصیحت
ہوگا وہ اسی طرح فضیحت

(۲۳) چھوٹے سے کام کا بڑا نتیجہ

ایک بچّہ کہ ابھی کچھ اُسے تمیز نہ تھی
لہو و بازی سے پسندیدہ کوئی چیز نہ تھی

کھیلنا۔ کودنا۔ کھانا۔ یہی معمول تھا بس
انہیں طفلانہ تمنّاؤں میں مشغول تھا بس

ایک تالاب تھا دو چار قدم گھر سے پرے
دل میں لہرآئی لبِ آب ذرا سیر کرے

صاف پانی سے جو تالاب کو پایا لبریز
کھیل کا شوق طبیعت میں ہوا اور بھی تیز

اُس پاس اپنے جو پایا کوئی کنکر پتھر
پھینک مارا اُسے پانی میں بہت خوش ہو کر

کھیل تھا پہلے تو اب طرفہ تماشا دیکھا
دل ہی دل میں متحیّر تھا کہ یہ کیا دیکھا

دائرہ ایک بنا ایسا کہ بڑھتا ہے محیط
گھیر لی جس نے کہ تالاب کی سب سطح بسیط

پھر تو کھیل اُس کا اسی شغل پہ موقوف رہا
اسی نظّارہ میں تا دیر وہ مصروف رہا

اسی اثنا میں ہوا بچہّ کی ماں کا بھی گزر
بولا اماں مجھے آئی ہے عجب چیز نظر
جو نہ دیکھی نہ سُنی تھی کبھی اب سے پہلے
شاید آئی ہے نظر مجھکو ہی سب سے پہلے
اک ذرا سی حرکت اور یہ تاثیر عجیب
دائرہ بڑھکے پہونچتا ہے کنارے کے قریب
بسکہ جی جان سے اِس شعبدہ پر تھا شیدا
وسعتِ دائرہ کی اپنے عمل سے پیدا
تھی وہ ماں اہلِ دل اور نیک منش نیک نہاد
ہنس کے فرمایا مری جاں یہ نصیحت رکھ یاد
یوں ہیں ہر کام کا ہو جاتا ہے انجام بڑا
گو کہ آغاز میں ہوتا نہیں وہ کام بڑا
کبھی ادنیٰ حرکت زلزلہ بن جاتی ہے
کبھی ناچیز سی اک بات غضب ڈھاتی ہے

یہ ہی انداز نکوکاری و بدکاری ہے
اولاً خاص تھی اب عام میں وہ جاری ہے

(۴۴) اونٹ

اونٹ تو ہے بس حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال
تیری پیدائش رفاہِ عام ہے
آدمی کے حق میں اک انعام ہے
کھانے کپڑے کا بھی تجھ پر ہے مدار
تو نے دی ہے اُس کو تیزی مستعار
لق و دق صحرا میں یا میدان میں
یا عرب کے گرم ریگستان میں
سایہ افگن ہے نہ واں کوئی چٹان
سردِ پانی کا نہ دریا کا نشان
چلچلاتی دھوپ ہے اور چپ ہوا
واں پرندہ بھی نہیں پر مارتا

تو وہاں کے مرحلے کرتا ہے طے
دن بدن اور ہفتہ ہفتہ پے بہ پے

قیمتی اشیا ہیں تیری پشت پر
تاجروں کا ریشم اور شاہوں کا زر

تودہ تودہ تیرے اوپر لد رہا
ہے بھرا گویا جہاز بے بہا

چند ہفتے جب کہ جاتے ہیں گزر
اور تھکا دیتا ہے راکب کو سفر

اونٹ! گھبراتا نہیں تو بار سے
دیکھتا ہے اُس کی جانب پیار سے

گویا کہتا ہے کہ اے میرے سوار
ایک دن تو اور بھی ہمت نہ ہار

ہاں نہ ہو بیدل نہ رستے میں ٹھٹک
صاف سر چشمہ ہے آگے دھر لپک

مجھ کو آتی ہے ہوا سے بوئے آب
ناامیدی سے نہ کر تو اضطراب

اونٹ تو کرتا ہے اُس کی رہبری
یوں بنا دیتا ہے راکب کو جری

آخرش منزل پہ پہونچاتا ہے تو
اور سوکھے خار و خس کھاتا ہے تو

صبر سے کرتا ہے طے راہِ دراز
سچ کہا ہے تو ہے خشکی کا جہاز

الغرض تو ہے حلیم و خوش خصال
تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال

(۳۵) شیر

اے شیر تیرے تن پہ ہے طاقت کا پوستیں
شاہی کے حق میں کوئی بھی ساجھی ترا نہیں

پیدا ہے تیرے رُخ سے تری شوکت اور جلال
ظاہر ہے تیری شکل سے باطن کا تیرے حال
دل تیرا بزدلی و غلامی سے ہے بری
پھٹکے نہ تیرے پاس کبھی خوف اے جری
تیرا حریف کون ہے جو تو ہٹے بچے
جھپکے نہ تیری آنکھ نہ گردن تری لچے
حق نے عطا کیا ہے تجھے زورِ بے خلل
فولاد کی رگیں ہیں تو ہے دل ترا اٹل
گر سورما سجے کوئی میدان کا دھنی
جوشن کہ چار آئینہ یا خود آہنی
حملہ سے تیرے بچنے کو کافی نہ ہو مگر
اللہ رے تیرا حوصلہ بل بے ترا جگر
غُرّا کے شیر کرتا ہے جب جوش اور خروش
جنگل تمام ہوتا ہے سنسان اور خموش
پہچانتے ہیں جانور آواز شیر کی
وہ ہولناک ہے کہ دہلتا ہے سب کا جی
جاتی ہے اُن کے پاؤں تلے کی زمین نکل

ہیں بھاگتے کہ گویا تعاقب میں ہے اجل
اے شیر گرم خطّہ ہے تیرے لئے وطن
بیہڑ ہو۔ نیستاں ہو۔ جھاڑی ہو یا ہو بن
لُو ہو۔ کہ گرم دُھوپ ہو یا ریگ زار ہو
تینوں غضب ہیں کیوں نہ مسافر شکار ہو
اے شیر تو ہے شاہ ترا تخت ہے کچھار
ہے کس کو تیرے ملک میں دعوئ گیر و دار

(٣٦) کیڑا

تم اِس کیڑے کو دیکھو تو لگا تار تمھاری راہ میں ہے گرم رفتار
چلا کترا کے کیا کیا پیچ و خم سے جھجکتا ہے یہ آوازِ قدم سے
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے سویرے اُٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
کرو چشمِ حقیقت بین سے تمیز کہ سمجھے ہو جسے تم سخت ناچیز
اُسے قدرت نے زرّیں پر دئے ہیں کچھ اک سبزی و سُرخی بھی لئے ہیں
تمھیں لگتی ہے اچھّی مور کی دم کہ خوش ہوتے ہو اُس کو دیکھ کر تم
جو دیکھو ناچ اُس کا دور ہی سے تو اس پر لوٹ ہو جاتے ہو جی سے
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا یہ مانا خاک مٹی میں ہے لیٹا

نوٹ۔ سلہ یہ نظم سنہ میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

نہ بے پروائی سے چلیئے جھپٹ کر — قدم رکھئیے ذرا کیڑے سے ہٹ کر
کہ ہے دونو سے دانا دیکھ سکتا — نمونے دو ہیں گاریگر ہے یکتا
ہے دونو ہی میں یکساں دستکاری — کسے ہلکی کہیں اور کس کو بھاری
ہے ان دونوں کو اُس کا لطف حاصل — کہ بخشا ہے برابر عیشِ کامل
اگر ہے خوبصورت مور پیارا — تو کیڑا بے گنہ کیوں جائے مارا
بظاہر کچھ نہیں اُس کی حقیقت — مگر جب اُس کی کرتے ہو بُری گت

تو ہے ننھی سی جاں اُس کی تڑپتی
ہے تم جیسا ہی اک جاندار وہ بھی

(۳۷) ایک قانع مفلس[۱]

سو ہزار ایکڑ ہے کلّن کی زمیں — مِلک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اُس کا نہایت شان دار — اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار
اَن گنت ہے اُس کی نقدی اور مال — ایک پائی کے لئے میں پائمال
اُس کا رتبہ ہے بڑا عزت بڑی — میرے سر پہ خاک ذلّت کی پڑی
ہے زمیندار آج کلّن واقعی — زر سے پُر ہے اُس کا دامن واقعی
پر جہاں تک میری جاتی ہے نظر — مِلک سب اپنی ہی آتی ہے نظر

[۱] - یہ نظم بھی [illegible]ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

لطف جو اس حال میں ہے بالیقیں — دولتِ دنیا میں آدھا بھی نہیں
سُست ہے گلّن بایں ناز و نعم — میں ہوں چاق و چست ہر دم تازہ دم
واں امیرانہ ہے مخمل کا لباس — میں ہوں مفلس میری پوشش ہے پلاس
وہ ہے قیدی ۔ پائے بندِ ملک و مال — اور میں آزاد ہوں مثلِ خیال
ڈاکٹر واں بیٹھے ہیں بہرِ علاج — یاں نہیں ہے ایک کی بھی احتیاج
ہے مصیبت مال و دولت میں بڑی — موت کا دھڑکا ہے اُس کو ہر گھڑی
لطف قدرت کا نہیں اُس کو نصیب — یہ بہارِ بے خزاں بھی ہے عجیب
یہ بیاباں یہ سمندر یہ ہوا — گو بجتی ہے ان میں قدرت کی نوا
کان سے گلّن کی لیکن دور ہے — وہ تو دولت کے نشہ میں چور ہے

راگنی قدرت کی ہر دم ہے چھڑی
میں تو ہوں اس لے کا دیوانہ سڑی

(۳۸) موت کی گھڑی[1]

جب کہ طوفاں ہو زندگی میں بپا — گھیر لیں ہر طرف سے موج و ہوا
جب کہ لغزش میں پانو تیرا ہو — اور آنکھوں تلے اندھیرا ہو
بلکہ ہوش و حواس بھی ہوں جُدا — ڈر نہ زنہار ۔ رکھ نظر بخدا

---

[1] یہ نظم بھی ۱۸۹۵ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

تھام دل کو نہ خوف کر نہ ہراس کہ نگہباں ہے تیرا تیرے پاس
تھا جو ایّامِ عیش کا ہمدم ہم پیالہ شریکِ شادی و غم
لہو و بازی میں ساتھ رہتا تھا ہر گھڑی نرم و گرم سہتا تھا
آنکھ تجھ سے اگر چرا جائے ابرِ غم جب کہ تجھ پہ چھا جائے
اُس محبّت کا دل میں باندھ خیال جس کو ہرگز نہیں ہے بیم و زوال
آرزوئیں تھیں وہ جو دل میں بھری ٹمٹماتے چراغ تھے سحری
کر دے اِن وسوسوں کو دل سے دور اُس محبّت کو دیکھ جو ہے سرور
ہے شگفتہ ازل سے تا بہ ابد نہ کبھی خاتمہ نہ اُس کی حد
جب عزیز و قریب یار نہ ہوں دوستداری میں استوار نہ ہوں
یعنی فرزند جیسا لختِ جگر اور ہم خانہ جیسے جاں پرور
گر دمِ واپسیں جدا ہو جائیں وقت کے وقت سب ہوا ہو جائیں
کر توقع نہ غم گساری کی یاد کر گور کی وہ تاریکی
اُس وطن کی طرف ہو راہ سپر کہ محبّت جہاں ہے تازہ و تر
آہ جب آئے موت کی نوبت آنے والی گھڑی ہو پُر ہیبت
اور گزرے ہوئے زمانہ پر ڈالتی آئے پردہ سرتاسر
دل کو رکھ تو امید پر شیدا
ہو نہ حسرت نگاہ سے پیدا

(۳۹) فادر ولیم[۱]

نوجواں آدمی نے کی تقریر
انّے پدر ولیم اب تو ہو تم پیر

چند موئے سفید ہیں باقی
کہ نمایاں ہے جن میں برّاقی

لیک ویسے ہی تندرست ہو تم
خوب چاق و دلیر و چست ہو تم

سن کے ولیم نے یوں زباں کھولی
گرہِ پرسشِ نہاں کھولی

تھی جوانی میں یہ نصیحت یاد
کہ ہے عہدِ شباب صورتِ باد

اس لئے طاقت و توانائی
کی نہ ضائع بعہد برنائی

تاکہ انجام کار وقتِ اخیر
ہوں نہ محتاج اِن کا بنکر پیر

بولا پھر وہ جوانِ نیک شیم
تم تو ہو پیر اے پدر ولیم

اور ناپائدار لطفِ شباب
ہوتے ہیں کوئی دم کے مثلِ حباب

مگر ان کا الم نہیں تم کو
حسرتِ بیش و کم نہیں تم کو

کچھ بیاں کیجئے گا صاف اِس کا
تاکہ ہو مجھ پہ انکشاف اس کا

ولیمِ پیر نے جواب دیا
کیا پسندیدہ با صواب دیا

میں جوانی میں کہتا تھا ہر بار
کہ یہ دن دیرپا نہیں زنہار

اس لئے تھا خیال آیندہ
سوچتا تھا مآل آیندہ

تاکہ پاؤں غم و الم سے اماں
نہ رہے حسرتِ گزشتہ زماں

---

[۱] یہ نظم بھی سنہء میں انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی تھی ۱۲

پھر بھی گویا ہوا جوانِ لطیف — اے پدر تم تو ہو گئے ہو ضعیف
اور گزرتی ہے زندگانی جلد — چھوڑنی ہے سرائے فانی جلد
ظاہر اکس قدر مُسن ہو تم — مگر اس پر بھی مطمئن ہو تم
ہے تمھیں ذوقِ داستانِ اجل — اور پسندیدہ ہے بیانِ اجل
مدعا یہ ہے کچھ بیاں ہو جائے — رازِ پوشیدہ تا عیاں ہو جائے
وہ مخاطب ہوا بسوئے جواں — کہ ہے البتّہ مجھ کو اطمیناں
کیونکہ ایّامِ نوجوانی میں — موسمِ عیش و کامرانی میں
میں نے اپنے خدا کو رکھّا یاد — نہ کیا اُس سے نفس کو آزاد

وہی اب میرا دستگیر ہوا
لطفِ یزداں عصائے پیر ہوا

(۴۰) حبِ وطن[لہ]

دل میں اک چاشنی محبّت کی — جملہ جاندار کو خدا نے دی
قلبِ انسان ہی پہ کیا ہے مدار — کہ ہر اک دل میں ہے اُسی کا شرار
ایک اسپین کی جواں طوطی — جو کہ بچپن سے تھی اسیر ہوئی
وہ درخشاں پَر خجستہ نوا — ہوئی واردِ بملکِ سردِ ملا
اُس نے وہ پر شمیم نخلستاں — کہ نکالے تھے پرّ و بال جہاں

لہ۔ یہ نظم بھی ۱۸۶۸ء میں ایک انگریزی پوئٹری سے ترجمہ کی گئی ۱۲

اور وہ ملک و میوہ ہائے وطن
آسمانِ وطن ہوائے وطن

سب فراموش کر دیئے ناچار
تھا یہاں اور رنگِ لیل و نہار

تیرہ و تار وادیِ پُر دود
ساحتِ آسماں بخار آلود

اور بسیطِ زمیں پر از خاشاک
قلّۂ کوہ و موجِ دہشت ناک

یاں کے القصّہ دیکھکر یہ ساز
چشمِ زرّیں سے تھی نظر انداز

اِس دیارِ غریب میں آکر
سرد خطّہ میں پرورش پاکر

رہی شکّر شکن وہ خوش گفتار
باعثِ طولِ عمر آخر کار

اُس کے زرّیں زمرّدیں پر و بال
بھورے بھورے سے ہوگئے فی الحال

عاقبت ایسی صُمّ و بُکم بنی
چہچہے وہ نہ وہ شکر شکنی

اِسی اثنا میں ایک مردِ غریب
آیا اسپین سے ملا کے قریب

اُس نے طوطی سے جا کلام کیا
حرفِ اسپین میں سلام کیا

دیا اُس نے اُسی زباں میں جواب
اور کُنجِ قفس میں ہو بیتاب

کیا ہی مسرور چہچہا کے ہوئی
آخر آخر پھڑک پھڑک کے موئی

(۱۴) انسان کی خام خیالی

اے دیدہ ورانِ دانش آثار
دنیا میں ہیں کیسے کیسے جاندار

ہاتھی چیونٹی عقاب مکھی — قدرت نے ہے سب میں بات رکھی
ایسا تو بتاؤ کوئی حیوان — جیسا نادان ہے یہ انساں
ہر ایک ہے اپنی راہ چلتا — جس رہ سے ہے مدعا نکلتا
آرام و خورش جو چاہتے ہیں — قدرت کی روش نباہتے ہیں
جس چیز سے ہے گزند اُن کو — آتی ہی نہیں پسند اُن کو
جس شے سے ہیں فائدہ اُٹھاتے — دھوکا نہیں اُس میں گاہ کھاتے
انساں ہے اگرچہ سب پہ فائق — مشہور ہے اشرف الخلائق
اُڑتا ہے مگر اُسی کا خاکا — پُتلا ہے یہ سہو اور خطا کا
ممکن ہی نہیں خیالِ پرواز — کرنے لگے بیل صورتِ باز
یا چھوڑ کے عرصۂ چراگاہ — غواص ہو مچھلیوں کے ہمراہ
انسان بخلافِ حکمِ قدرت — کرتا ہے خیالِ ترکِ فطرت
ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن — جب تک کہ نہ ہو صفائے باطن
یا نفس کہ تابعِ خرد ہو — حاصل تب راحتِ ابد ہو
یا وہ دلِ صاف اور فیاض — ہو خود غرضی سے جس کو اعراض
یا صبر کہ خندہ زن ہو اکثر — مجبوریِ بختِ نارسا پر
شاکر قسمت ہی پر رہے وہ — قدرت کو اُلاہنا نہ دے وہ
یا عقل کہ ہو سلیم و یکسو — اندوہ سے ہو نہ چیں بابرو

یہ رمز کہ ہو چکے ہویدا　　ہے اصل خوشی انہیں میں پیدا
جو لوگ ہیں عقل سے گزرتے　　بیہودہ خوشی پہ ہیں وہ مرتے
گر ہووے خلاف اِس کے مضمون
باطل ہیں دلائلِ فلاطوں

(۴۲) کوہ ہمالہ

ہے ہمالہ پہاڑ سرجیون　　جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن
بیل بوٹوں سے بن رہا ہے چمن　　سبز چوٹی ہرے بھرے دامن
ہے ہر اک ڈھانگ اُس کی پھلواری　　سرد چشمے اِدھر اُدھر جاری
لالہ خودرو ہے اور اُس کے پاس　　لہلہاتی ہے خوبصورت گھاس
سیکڑوں قسم کے ہیں پھول کھلے　　پیڑ باہم کھڑے ہوئے ہیں ملے
کہیں بن مالنا کہیں بیلا　　کہیں اخروٹ اور کہیں کیلا
سال کا کیا ہی خوب جنگل ہے　　سور ماؤں کا بن کے دنگل ہے
سرو و شمشاد ہیں قطار قطار　　ریچھ پھرتے ہیں بن کے چوکیدار
ہیں چٹانوں پہ کودتے لنگور　　ایک ہی جست میں وہ پہونچے دور
ہیں ترائی میں ہاتھیوں کے غول　　کوئی پاپل ہے اور کوئی بھنبول
شیرِ خونخوار شاہ ہے یاں کا　　پاڑھے چیتل کو خوف ہے جاں کا

بارہ سنگے غریب پر ہے لتاڑ — سینگ ہیں اُس کے جھاڑ او جھنکاڑ
وہ جو ہے ہند کا بڑا ساگر — واں سے چلتا ہے ابر کا لشکر
کوچ در کوچ روز بڑھتا ہے — پھر ہمالہ پہ آکے چڑھتا ہے
کبھی دیتا ہے باندھ مینہ کا تار — کبھی کرتا ہے برف کی بھرمار
جا چڑھا یوں پہاڑ پر پانی — کی ہے قدرت نے کیا ہی آسانی
واں سے چشمے بہت اُبل نکلے — ندی نالے ہزار چل نکلے
سندھ و ستلج ہیں مغربی دریا — اور پورب میں میگھنا گنگا
ہیں یہ دریا بہت بڑے چاروں — جن میں بہتا ہے پانی الغاروں
پس سمندر سے جو رسد آئی — یوں ہمالہ نے بانٹ کر کھائی
ہوا سرسبز ہند کا میدان — تیری حکمت کے اے خدا قربان
ہند کی سرزمیں ہے اَن ماتا — اور ہمالہ پہاڑ جل داتا
اے ہمالہ پہاڑ! تیری شان — دنگ رہ جائے دیکھکر انسان
ساری دُنیا میں ہے تو ہی بالا — پہونچے جب پاس دیکھنے والا
سامنے اک سیاہ دل بادل — دیو کی طرح سے کھڑا ہے اٹل
گھاٹیاں جن میں گونجتی ہے صدا — آبشاروں کا شور ہے برپا
دبدبہ اپنا تو دکھاتا ہے — گویا میدان کو ڈراتا ہے
ہے مرے دل میں یہ خیال آتا — کاش چوٹی پہ تیرے چڑھ جاتا

واں سے نیچے کا دیکھتا میداں — جس میں گنگ و جمن ہیں تیز رواں
دو لکیریں سی وہ نظر آتیں — دائیں بائیں کو صاف لہراتیں
اس تماشے سے جب کہ جی بھرتا — تو شمالی طرف نظر کرتا
شام کو دیکھتا بہار بڑی — گویا سونے کی ہے فصیل کھڑی

پھر وطن میں جب آن کر رہتا
دوستوں سے یہ ماجرا کہتا

(۴۳) بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی — پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ — ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا — میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس — اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم — مٹّی پتھّر تمام ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت — پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری — میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم — سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی — کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور   ہمّت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت   بھڑکی اُس کی رگِ حمیّت
بولا للکار کر کہ آؤ   میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہوسکے کچھ احسان   ڈالو مردہ زمین میں جان
یارو! یہ ہیچر مچر کہاں تک   اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کروگے جانفشانی   میدان پہ پھیر دوگے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں   آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ   "دشوار ہے جی پہ کھیل جانا"
ہرچند کہ تھا وہ بے بضاعت   کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اُس سخی کی   دو چار سے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا   قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار   بارش لگی ہونے موسلادھار
پانی پانی ہوا بیاباں   سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت   اُس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جرأت قطرہ کی کرگئی کام   باقی ہے جہاں میں آج تک نام
اے صاحبو! قوم کی خبر لو   قطروں کا سا اتفاق کرلو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری   چل نکلیں گی کشتیاں تمہاری

(۴۴) مثنوی بادِ مراد

چل اے بادِ بہاری سمتِ گلزار
تمنّائی ہے تیرا ہر گل و خار

نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سُنساں
گیاہِ مُردہ میں تو ڈال دے جان

نہیں گلشن میں پتّے کا بھی کھڑکا
ذرا شاخیں ہلا۔ طائر کو بھڑکا

لہک تیزی سے اے بادِ بہاری
کہ ہو جائے چمن پر وجد طاری

جو تو لہکے تو سبزہ لہلہائے
چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے

لچک جائے کمر نازک شجر کی
زمیں پر جھک پڑے ڈالی ثمر کی

ٹپک جائے جو ہو پکّا ہوا پھل
کہ شاخیں ہو رہی ہیں سخت بوجھل

سُنا۔ بادِ صبا! کیا کیا خبر ہے
قلمرو میں تیری کل بحر و بر ہے

ذرا کر دامنِ صحرا میں راحت
بہت کی تو نے دریا کی سیاحت

بس اب آرام کر لوگوں کے گھر میں
رہی تا دیر تو سیر و سفر میں

تیرے ہمرہ چلے آتے ہیں مبہم
یہی ہیں کیا سفیرِ بحرِ اعظم

جلو میں ہے تیرے اک فوج جرّار
تو ہی ہے ابر کے لشکر کی سردار

اُٹھایا ہے سمندر تو نے سر پہ
گھٹا کو لاد کر لائی کمر پر

تیری تیزی سے ہیں بادل لپکتے
ترے جھونکوں سے ہیں قطرے ٹپکتے

غزل

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے
ہجومِ طائرانِ خوش نوا ہے

کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے
کبھی آہستہ رو موجِ صبا ہے

غبار و گرد سے جو اٹ گئی تھی
صبا نے غسل کا ساماں کیا ہے

ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں
کہ خوبانِ چمن کا سر ملا ہے

چمن کا پتّا پتّا ہے نوا سنج
صبا کی آمد آمد جا بجا ہے

گلوں کی ڈالیاں جھک جھک گئی ہیں
زمیں پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے

کھلی ہر پنکھڑی گلہائے تر کی
صبا نے کان میں کیا کہدیا ہے

بکھیری نسترن پر زلف سنبل
صبا شوخی میں فتنہ ہے بلا ہے

گیاہِ سبز کا طُرّہ پریشان
صبا تیرے ہی چھیڑے سے ہوا ہے

نہیں ہے مجھ کو دعویٰ شاعری کا
تو پھر مقطع سے بھی کیا مدّعا ہے

کرا اے بادِ مراد آہنگ آفاق
جہازِ سست رو ہے تیز اشتاق

پھریرے کو اڑا اس بادباں کو
کہ دیکھیں ساحلِ ہندوستاں کو

خلیج و آبنائے و بحر و ساحل
ترے دیکھے پڑے ہیں سب مراحل

مقامِ استوا سے تا بہ قطبین
تجھے جنبش نہیں دیتی کبھی چین

بہت کھونڈے ہیں کوہ و دشت تو نے
کیا بحرین کا گلگشت تو نے

محیطِ ارض ہے تو اے سبک پا
تری موجیں رواں ہیں مثلِ دریا
لطیف و نازک و بے رنگ ہے تو
اُصولِ نغمہ و آہنگ ہے تو
رواں ہے تیری موجوں میں ہر آواز
تو ہی کانوں میں ہے ہنگامہ پرداز
جہاں میں تو رسولِ ہر ندا ہے
مذاقِ سامعہ تجھ پر فدا ہے
نہ پہونچے تو اگر تا پردۂ گوش
سب آوازیں رہیں پردہ میں روپوش
وہ بہرا ہے جو تجھ سے بے اثر ہے
وہ سُنتا ہے جو تجھ سے بہرہ ور ہے
زباں کو نطق کا یارا ہے تجھ سے
جہاں میں شور و شر سارا ہے تجھ سے
حجابِ دیدۂ بینا نہیں تو
نگہ سے گرچہ ہے پردہ نشیں تو
ترے کھانے سے دم لیتی ہے خلقت
ترے کھانے پہ دم دیتی ہے خلقت
ہمیں تیری ضرورت ہے بہر طور
نہیں ایسی ضروری شے کوئی اور
اگر اک لمحہ گزرے ہم پہ تجھ بن
تو ہو جائے تنفّس غیر ممکن
ہے تیرا شغل دائم پاسِ انفاس
نہیں ہے ورنہ تجھ بن زیست کی آس
تو ہی ہے اے نسیمِ صبح گاہی
مثالِ رحمتِ عامِ الٰہی
جہاں میں ہیں ترے الطاف حاوی
غریبوں اور امیروں پر مساوی
کبھی بنتی ہے ایسی تند و پر شور
معاذ اللہ! معاذ اللہ! ترا زور
اگر تو خشمگیں اے تند خو ہو
تہ و بالا جہازِ جنگ جو ہو
کبھی دریا میں لے جائے بہا کر
کبھی ساحل پہ دے پٹکے اُٹھا کر

اُڑاتی ہے اُسے تو راہ بے راہ
جہاز آگے ترے مثلِ پرِ کاہ

معاذ اللہ ترا طوفاں غضب ہے
تیری تیزی نشانِ قہرِ رب ہے

اُجاڑا تو نے گلزار و چمن کو
ہلا ڈالا ہے جنگل اور بن کو

یہ چھیڑا نے میں کیسا راگ تو نے
نیستاں میں لگا دی آگ تو نے

تیری رفتار ہے بے باک کیسی
اُڑاتی ہے زمیں کی خاک کیسی

یہ گُل کترے ہیں تو نے بے تامل
کیا اک دم زدن میں شمع کو گل

کبھی گرمی سے گرما گرم ہے تو
کبھی سردی سے سرد و نرم ہے تو

چُرا لیتی ہے تو پانی کو چپ چاپ
نظر آتا نہیں جب بن گیا بھاپ

برودت کی پولیس نے تجھ کو گھیرا
تو کچھ کچھ مال مسروقہ بھی پھیرا

جو بادی چور تو ایسی نہ ہوتی
نہ پاتے صبح کو شبنم کے موتی

دبائیں تو نہیں دبنے سے انکار
تیری عادت نہیں ہے ضد و اصرار

خوشامد تیری خصلت میں نہیں ہے
تری تیزی برابر ہر کہیں ہے

اُجاڑا اگر کسی مفلس کا چھپّر
اُکھاڑا خیمہ و خرگاہِ لشکر

نہ در گزرے غریبوں کے مکاں سے
نہ جھجکے طرّۂ تاجِ شہاں سے

نہیں کچھ تجھ کو خوفِ شانِ سلطاں
اُڑایا پردۂ ایوانِ سلطاں

کسی کا طرّۂ طرّار چھیڑا
کسی کا برقعِ زرتار چھیڑا

غرض دلچسپ تیری ہر ادا ہے
تیری شوخی و چالاکی بجا ہے

(۴۵) ایک گنوار اور قوس قزح

تھی شام قریب اور دہقاں
میداں میں تھا گلہ کا نگہباں

دیکھی اُس نے کمان ناگاہ
جو کرتی ہے مینہ سے ہم کو آگاہ

رنگت میں اُسے عجیب پایا
ظاہر میں بہت قریب پایا

پہلے سے وہ سن چکا تھا اکثر
ہے قوس میں اِک پیالۂ زر

مشہور بہت ہے یہ کہانی
افسانہ تراش کی زبانی

ملتی ہے جہاں کماں زمیں سے
ملتا ہے وہ جامِ زر وہیں سے

سوچا لو جام اور بنو جم
چھوڑو بز و گوسفند کا غم

بیہودہ گنوار اِس گماں پر
سیدھا گیا تیر سا کماں پر

دن گھٹنے لگا قدم بڑھایا
امیّد کہ اب خزانہ پایا

جتنی کوشش زیادہ تر کی
اُتنی ہی کماں پرے کو سرکی

پنہاں ہوئی قوس آخرِ کار
اور ظلمتِ شب ہوئی نمودار

ناکام پھرا وہ سادہ دہقاں
حسرت زدہ غم زدہ پشیماں

(۴۶) ترکِ تکبّر

بلندی سے چلا سیلابِ پُرزور — پہاڑی گھاٹیوں میں مچ گیا شور
ہوا اس تیزی و تندی سے جاری — کہ تھی سنگِ گراں پر ہول طاری
شجر تو کیا اُٹھاتے اُس کی ٹکّر — بہم ٹکرا دئے پتھّر سے پتھّر
غرض ڈھایا بہایا اور توڑا — پڑا جو سامنے اُس کو نہ چھوڑا
چلا وادی کی جانب موج در موج — جلو میں تھی خس و خاشاک کی فوج
اُسی زمرہ میں اک لکڑی بھی بہتی — چلی جاتی تھی اور یوں دل میں کہتی
"میں راہ و رسم منزل سے ہوں آگاہ — یہ سارا قافلہ ہے میرے ہمراہ
اشاروں پر مرے چلتا ہے پانی — ہے میرے بس میں دریا کی روانی
مرے دم سے رواں یہ کارواں ہے — مرا تابع ہے جو کوئی یہاں ہے"
قضارا موج نے پلٹا جو کھایا — تو اک پتھر نے لکڑی کو دبایا
کہا لکڑی نے او گستاخ مغرور — مرے دامن سے اپنا ہاتھ رکھ دور
کہ میں ہی بدرقہ ہوں رہنما ہوں — امیرِ بحر ہوں اور ناخدا ہوں
مجھے او بے ادب کیوں تو نے چھیڑا — جو میں ڈوبی تو بس ڈوبا یہ بیڑا
رکوں گی میں تو رک جائے گا دریا — کڑھے گا اور پچھتائے گا دریا
کہا پتھر نے کہہ ساحل سے احوال — کہ ہے ہم سب میں وہ پیرِ کہن سال

کہی لکڑی نے ساحل سے وہی بات
تو ساحل نے صدا یوں دی کہ ہیہات!
ہزاروں مدعی آ کے بھی آئے
بہت جوش و خروش اپنے دکھائے
گیا سالم نہ کوئی اس بھنور سے
یہی دیکھا کیا ہوں عمر بھر سے
ہوئے یاں غرق لاکھوں تجھ سے فرعون
نہ پوچھا پھر کسی نے یہ کہ تھے کون
مگر دریا کی باقی ہے وہی آن
وہی رونق، وہی عظمت، وہی شان
نہیں دریا کی موّاجی میں کچھ فرق
اُسے کیا غم ترے کوئی کہ ہو غرق

(۴۷) حیا

او حیا! او پاسبانِ آبرو!
نیکیوں کی قوتِ بازو ہے تو
پاکدامنی پہ تجھ کو ناز ہے
کیا ہی تیرا دل پذیر انداز ہے
کُھب گئی جب آنکھ میں تو مثلِ نور
بد نگاہی سے رہی وہ آنکھ دور
دامنِ عصمت کو تو رکھتی ہے پاک
ہے سدا جرم و گنہ سے تجھ کو باک
گر نہ ہوتا درمیاں تیرا حجاب
فعلِ بد سے کون کرتا اجتناب
خواہشوں کو جو نہ تو دیتی لگام
آدمی حیوان بن جائے تمام
جب خطا کرتی ہے دل میں شور و شر
تو ہی بنجاتی ہے واں سینہ سپر
ذلّت و خواری تجھے بھاتی نہیں
تاب رسوائی کی تو لاتی نہیں

تو مذلّت کو سمجھتی زہر ہے | اور ملامت تیرے حق میں قہر ہے
مُفلسوں کی ہی تو ہی پشت و پناہ | تو سجھاتی ہے عرق ریزی کی راہ
گو تہی دستی کے ہو جائیں شکار | ہے مگر تجھ کو گدائی ننگ و عار
ہے ترے نزدیک مرجانا پسند | پر نہیں ہے ہاتھ پھیلانا پسند
اِس قدر تجھ کو نہیں پروائے نان | جس قدر تو آن پر دیتی ہے جان
آبرو کھوتی نہیں از بہرِ قوت | لب پہ بنجاتی ہے تو مہرِ سکوت
اغنیا کے دل کو گرماتی ہے تو | مجّل اور خسّت سے شرماتی ہے تو

تو سکھا دیتی ہے اُن کو بذلِ مال
زخمِ خنجر ہے تجھے ردِّ سوال

(۴۸) کچھوا اور خرگوش

ایک کچھوے کے آگئی جی میں | کیجیے سیر و گشت خشکی میں
جا رہا تھا چلا ہوا خاموش | اُس سے ناحق اُلجھ پڑا خرگوش
میاں کچھوے تمھاری چال ہے یہ | یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ
یُوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو | گویا اُتّو زمیں پہ کرتے ہو
کیوں ہوئے چل کے مفت میں بدنام | بے چلے کیا اٹک رہا تھا کام
تم کو یہ حوصلہ نہ کرنا تھا | چلّو پانی میں ڈوب مرنا تھا

یہ تن و توش اور یہ رفتار | ایسی رفتار پر خدا کی مار
بولا کچھوا کہ ہوں خفا نہ حضور | میں تو ہوں آپ معترف بہ قصور
اگر آہستگی ہے جرم و گناہ | تو میں خود اپنے جرم کا ہوں گواہ
مجھ کو جو سخت سست فرمایا | آپ نے سب درست فرمایا
مجھ کو غافل مگر نہ جانیئے گا | بندہ پرور بُرا نہ مانیئے گا
یوں زبانی جواب تو کیا دوں | شرط بد کر چلو تو دکھلا دوں
تم تو ہو آفتاب میں ذرّہ | پر مٹا دوں گا آپ کا غرّہ
سُن کے خرگوش نے یہ تلخ جواب | کہا کچھوے سے یوں ز روی عتاب
تو کرے میری ہمسری کا خیال | تیری یہ تاب یہ سکت یہ مجال
چیونٹی کے جو پر نکل آئے | تو یقیں ہے کہ اب اجل آئے
ارے بیباک ابد زباں مُنہ پھٹ | تو نے دیکھی کہاں ہے دوڑ جھپٹ
جب میں تیزی سے جست کرتا ہوں | شہسواروں کو پست کرتا ہوں
گرد کو میری باد پا نہ لگے | لاکھ دوڑے مرا پتہ نہ لگے
ریل ہوں برق ہوں چھلاوا ہوں | میں چھلاوے کا بلکہ باوا ہوں
تیری میری بھلا صحبت کیا | آسماں کو زمیں سے نسبت کیا
جس نے جھگتے ہوں تُرکی و تازی | ایسے مریل سے کیا بدے بازی
بات کو اب زیادہ کیا دوں طول | خیر کرتا ہوں تیری شرط قبول

ہے مناسب کہ امتحاں ہو جائے ۔۔۔ تاکہ عیب و ہنر عیاں ہو جائے
الغرض اِک مقام ٹھیرا کر ۔۔۔ ہوئے دونوں حریف گرمِ سفر
بسکہ زوروں پہ تھا چڑھا خرگوش ۔۔۔ تیزیِ پھُرتی سے یوں بڑھا خرگوش
جس طرح جائے توپ کا گولا ۔۔۔ یا گرے آسمان سے اولا
ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے ۔۔۔ اپنی چُستی پہ آفریں کر کے
کسی گوشہ میں سو گیا جا کر ۔۔۔ فکُر کیا ہے چلیں گے سستا کر"
اور کچھوا غریب آہستہ ۔۔۔ چلا سینہ کو خاک پر گھستا
سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے ۔۔۔ یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے
یوں ہی چلتا رہا بہ استقلال ۔۔۔ نہ کیا کچھ اِدھر اُدھر کا خیال
کام کرتا رہا جو پے در پے ۔۔۔ کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے
حیف! خرگوش رہ گیا سوتا ۔۔۔ ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا
جب کھُلی آنکھ تو سویرا تھا ۔۔۔ سخت شرمندگی نے گھیرا تھا
صبر و محنت میں ہے سرافرازی ۔۔۔ سُست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصہ یہ دل لگی کے لئے ۔۔۔ بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے

ہے سخن اِس حجاب میں روپوش
ورنہ کچھوا کہاں کہاں خرگوش

(۴۹) مناقشہ ہوا و آفتاب

بادِ صحرا نے کہا یوں ایک روز
مہرِ تاباں سے کہ اے گیتی فروز

تو ہے عُلوی، اور میں سفلی مگر
زورِ بازو میں ہوں میں تجھ سے زبر

نیرِّ اعظم نے فرمایا کہ ہاں
ہو اگر ثابت ز روئے امتحاں

ورنہ ہے پادر ہوا یہ قال و قیل
ہیچ ہے دعویٰ نہ ہو جب تک دلیل

بولی جو یوں ہے تو اچھا یوں سہی
ہاتھ کنگن کے لئے کیا آرسی

آیئے زور آزمائی کیجئے
اس بکھیڑے کی صفائی کیجئے

اک مسافر اپنی دھن میں تھا رواں
اُس کو ان دونوں نے تاکا ناگہاں

ہو گئے آپس میں طے قول و قرار
جو لبادہ لے مسافر کا اُتار

بس اُسی کے نام کا ڈنکا بجے
سر پہ دستارِ فضیلت وہ سجے

پھر تو آندھی بن کے چل نکلی ہوا
ایسی بپھری کر دیا طوفاں بپا

اونچے اونچے پیڑ تھرّانے لگے
جھوک سے جھوکوں کی چرّانے لگے

نونہالوں کی کمر بل کھا گئی
پھول پتّوں پر قیامت آگئی

کانپ اُٹھے اُس دشت کے کل وحش و طیر
مانگتے تھے اپنے اپنے دَم کی خیر

ہو گیا دامانِ صحرا گرد برد
گھِر گیا آفت میں وہ صحرا نورد

چاہتی تھی لوں لبادہ کو اُچک
مدعی کو دوں سرِ میدان زک

جب ہوا لیتی تھی چکّر میں لپیٹ
بیٹھ جاتا تھا وہ دامن کو سمیٹ

سینہ زوری سے نہ چوری سے ڈری
کر سکی لیکن نہ کچھ غارت گری

باندھ لی کس کر مسافر نے کمر
تا ہوا کا ہو نہ کپڑوں میں گزر

تھک گئی آخر نہ اُس کا بس چلا
ٹل گئی سر سے مسافر کے بلا

اب تھما جھکّڑ تو نکلا آفتاب
روئے نورانی سے سرکائی نقاب

تمکنت چہرے سے اُس کے آشکار
چال میں اک جبروباری اور وقار

وہ ہوا کی سی نہ تھی یاں دھوم دھام
کر رہا تھا چپکے چپکے اپنا کام

دھیمی دھیمی کرنیں چمکانے لگا
رفتہ رفتہ سب کو گرمانے لگا

اُس مسافر کو پسینا آگیا
کھول ڈالے بند جی گھبرا گیا

اور آگے کو بڑھا تو دھوپ سے
تن بدن میں کچھ پتنگے سے لگے

اب لبادہ کو لیا کاندھے پہ ڈال
بدلی یوں نوبت بہ نوبت چال ڈھال

جب چڑھا خورشید سمت الراس پر
بیٹھ کر سایہ میں پھر تو گھاس پر

دور پھینکا اُس لبادہ کو اُتار
واہ رے سورج ! لیا میدان مار

تیزی و تندی کے گرویدہ ہیں سب
کامیابی کا مگر ہے اور ڈھب

اُس کا گُر ہے نرمی و آہستگی
سرکشی کی رگ اُسی سے ہے دبی

(۵۰) نا قدر دانی

کہیں اک لعل کیچڑ میں پڑا تھا
نہ قامت بلکہ قیمت میں بڑا تھا

کوئی دہقاں اٹھا کر لے گیا گھر
وہ کیا جانے یہ پتھّر ہے کہ جوہر

نیا تحفہ جو بچّے کو دکھایا
اہا ہاہا! کھلونا ہم نے پایا

ہوئی جب لعل کی واں یہ مدارات
تو بولا حسرتا ہیہات ہیہات

نہیں اس گھر میں میری قدر ممکن
کہ اندھوں کے لئے کیا رات کیا دن

اگر پاتا مجھے کوئی نظر باز
تو کرتا اپنی قسمت پر وہ سَو ناز

جو لے جاتا مجھے تا درگہِ شاہ
تو مالا مال ہوتا حسب دلخواہ

اری نا قدر دانی تجھ پہ لعنت
کہ ہے تجھ کو مساوی نور و ظلمت

سمجھ لیتی ہے عیبوں کو ہنر تو
ہنر کی توڑ دیتی ہے کمر تو

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
خصوصاً تیری نالائق جفا سے

کہ ہے اندھے کی لاٹھی تیری بیداد
جہاں میں داد ہے جس کی نہ فریاد

(۵۱) جنگ[1] روم و روس

حالات روم سے ہمیں دن رات کام ہے
اخبار کا ورق نہیں خوانِ طعام ہے

[1] یہ مثنوی یکم شوال ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی ۱۲

کیسے خیالِ جنگ میں روزے گزر گئے
معلوم بھی نہیں کدھر آئے کدھر گئے

سوجھا نہ اور کچھ ہمیں اس بھوک پیاس میں
دن کاٹتے رہے اِنہیں خبروں کی آس میں

روزہ خبر بغیر ہمیں بار ہو گیا
آیا جو تارِ فتح تو افطار ہو گیا

چھٹکی ہوئی ہے چاندنی اور صاف آسماں
چُپ چاپ ہے زمین تو سنسان ہے جہاں

پتّا بھی دیکھیے تو کھڑکتا نہیں کوئی
طائر بھی آشیاں میں پھڑکتا نہیں کوئی

خلقِ خدا پڑی ہوئی سوتی ہے بے خبر
بجنے لگا ہے اتنے میں نقارۂ سحر

اس وقت جاگتے ہیں تو آتا ہے یہ خیال
اے ماہ کیا ہے خطۂ بلگیریا کا حال

کیا اب بھی گونجتا ہے وہ میدان توپ سے
آتش فشاں ہے لشکرِ عثمان توپ سے

بلقان کے دروں میں سلیمانِ صف شکن
کیا اب بھی ہے غنیم کے لشکر میں شعلہ زن

کیا خیمہ زن ہوئی ہے محمد علی کی فوج
یا جسترہ کی سمت رواں ہے مثالِ موج

بیکر کے شہسوار ہیں کس دار و گیر میں
کیا غلغلہ ہے کوچ کا ترکی بہیر میں

کیا اب بھی ہیں مجاہدِ اسلام جاگتے
ہیبت سے جن کی روسیہ پھرتے ہیں بھاگتے

کیا اب بھی ترکتاز میں ترکی سوار ہیں
جن غازیوں کی تیغ سے روسی فگار ہیں

کیا کر رہی ہے احمدِ مختار کی سپاہ
فیروز مند غازیِ جرار کی سپاہ

اے ماہِ نور بار سفر میں ہے تو مدام
حالات جنگ کے تجھے معلوم ہیں تمام

تو جا کے معرکہ میں چمکتا ہے رات بھر
اور سیر دیکھنے کو ٹھٹکتا ہے رات بھر

کرتے تھے اس طرح سے خیالی خطاب ہم
جب دیکھتے تھے لطفِ شبِ ماہتاب ہم

لیکن ہجوم اب تو ہے ابرِ بہار کا
ہے آسماں نمونہ صفِ کارزار کا

بجلی کے کوندنے میں ہے شمشیر کی ادا
اور بادلوں کی گھور گرج توپ کی صدا

یوں ابر جھوم جھوم کے آتا ہے بار بار
شپکا ہے جیسے حملۂ ترکانِ ذی وقار

بد دل ہے فوجِ روس تو ہو اور بھی خراب
عثمانیوں کا دبدبہ ہو جائے کامیاب

ہے یہ دعائے شام یہی نالۂ سحر
ہوں تُرک فتحیاب خدایا بکرّ و فر

عثمان پر جو لشکرِ روسی کا ہے ہجوم
ابرِ سیہ کی طرح سے آتا ہے جھوم جھوم

خود زار بھی گیا ہے کمالِ غرور سے
اور فوج جمع کی ہے بہت دور دور سے

عثمان یا خدا انھیں زیر و زبر کرے
سیلابِ خونِ روس سے مٹی کو تر کرے

ترکوں کو ایسی شوکت و شان و جلال دے
جو زلزلہ غنیم کے لشکر میں ڈال دے

مشرق کی سمت سے ہو سلیمان گرم کار
افواجِ زار وچ کو دکھا دے رہِ فرار

بلگیریا میں ختم ہو ہنگامہ جنگ کا
رومانیہ نشانہ ہو تُرکی تفنگ کا

دم بند روسیوں کا ہو صمصامِ تُرک سے
بھاگے سپاہِ روس فقط نامِ تُرک سے

محمود روزِ عید ہے دل سے دعا کرو
حامد یہ التجا بحضورِ خدا کرو

ترکی سپاہ میں علمِ فتح ہو بلند
پہونچے سپاہِ زار کو آزار اور گزند

(۵۲) مکالمۂ سیف و قلم

۱ سیف و قلم میں جو ہوئی دو بدو
شوق ہے تم کو تو سنو مو بمو

۲ خامہ لگا کہنے کہ اے تیغ تیز
تجھ سے بھلا کس کو مجالِ ستیز

۳ آب وہ تیری کہ نہ ٹھہرے نگاہ
آنچ وہ تیری - کہ خدا کی پناہ

۴ رہزنِ سفاک کی یاور ہے تو
خون کے دریا کی شناور ہے تو

۵ سیکھے ستم کس ستم ایجاد سے
شور ہے برپا تری بیداد سے

۶ شوخی و بے باکی و تیزی میں طاق
آگ ہے اور آب میں رہتی ہے غرق

۷ تند مزاجی میں تو شدّاد ہے
بیضۂ فولاد کی اولاد ہے

۸ آتشِ سوزاں کا پیا تو نے دود
اس لئے جاں سوز ہے تیرا وجود

۹ حیف تیری سختی و آہن دلی
نوعِ بشر کی ہے تو دشمن دلی

۱۰ خرمنِ ہستی میں لگاتی ہے آگ
عافیت و امن سے رکھتی ہے لاگ

۱۱ گو کہ مجلّا ہے تو آئینہ وار
تیرہ درونی ہے تیری آشکار

[illegible] ۱۲

۱۳ فتنۂ عالم ہے تیرا بانکپن
شوخی و شنگی ہے تیرا خاص فن

۱۴ شکل انوکھی تو نرالی ہے دھج
جسم بھی خمدار طبیعت بھی کج

۱۵ قحط زدوں کا سا تن و توش ہے
کھانے پہ ڈھو کے تو بلا نوش ہے

۱۶ عرصۂ راحت ہے ترے دم سے تنگ
ایسی لڑا کا کہ بنی خانہ جنگ

۱۷ تیری جبلت ہے فسوق و جدال | ناحق و حق کا نہیں تجھکو خیال
۱۸ قتل کا رکھتی ہے بہت چاؤ تو | رن میں کیا کرتی ہے ستھراؤ تو
۱۹ اُف نہ کرے لاکھ گلے کاٹ کر | جی نہ بھرے تیرا لہو چاٹ کر
۲۰ خلقِ خدا تجھ سے ہے آزارکش | کرتی ہی رہتی ہے سدا چپقلش
۲۱ بحرِ فنا کہئے ترے گھاٹ کو | جس نے دیئے سیکڑوں بیڑے ڈبو
۲۲ گرچہ سراپا ہے ترا آب گوں | پر تری چتون سے ٹپکتا ہے خون
۲۳ تو نے اُجاڑیں بہت آبادیاں | چھین لیں اقوام کی آزادیاں
۲۴ تو نے کروڑوں کیئے بچّے یتیم | لاکھوں ہی باپوں کے کیئے دل دو نیم
۲۵ لے گئی ماؤں کی کمائی کو لوٹ | رہگئیں بیچاریاں چھاتی کو کوٹ
۲۶ دُلہنیں روتی ہیں تری جان کو | ساتھ ہی لے جائیں گی ارمان کو
۲۷ موتیوں سے مانگ بھی جن کی بھری | اُن سے کراتی ہے تو گدیہ گری
۲۸ تو نے رفیقوں کو رُلایا ہے خوں | غم سے عزیزوں کو ہوا ہے جنوں
۲۹ تفرقہ پرداز! یہ کیا کردیا؟ | گوشت کو ناخن سے جُدا کردیا
۳۰ شیوہ ترا شہرۂ آفاق ہے | خوں خرابہ میں تو مشّاق ہے
۳۱ چاہتی ہے بغض و عداوت کو تو | اُنس و محبّت کی نہیں تجھ میں بُو
۳۲ تیری دغا بازی ہے ضرب المثل | غیر ہے قبضہ سے گئی جب نکل
۳۳ تو نے وفا کی نہیں پٹّی پڑھی | اُس کی ہوئی جس کے تو ہتّے چڑھی

۳۴ کون کرے تجھ سے رفاقت کی آس — کچھ نہیں تجھ کو حقِ صحبت کا پاس

۳۵ رکھتی نہیں سابقۂ لطف یاد — کور نمک ہے ترا کیا اعتماد

۳۶ میل حریفوں سے یگانوں سے چھوٹ — نکلے گا مالک کا نمک پھوٹ پھوٹ

۳۷ مملکتیں خاک سیہ تو نے کیں — تیری قساوت نے اُجاڑی زمین

۳۸ بستیاں کرتی ہیں پڑی بھائیں بھائیں — مقبرے آباد ہیں کچھ دائیں بائیں

۳۹ اُٹھّے تیری ذات سے جو جو فساد — اہلِ تواریخ کو کچھ کچھ ہیں یاد

۴۰ ثبتِ جریدہ اُنھیں میں نے کیا — ہے وہ خلاصہ تری روداد کا

۴۱ تو ہی بھرت کھنڈ کی بھارت میں تھی — تیری خوشی جانوں کی غارت میں تھی

۴۲ ہند کے جودھا تھے بڑے سوربیر — کھا گئی تو سب کو دمِ دار و گیر

۴۳ تو نے نصیحت نہ کسی کی سنی — چٹ کئے اُس عہد کے گیانی گنی

۴۴ وادیِ توران میں چمکی کبھی — دیتی تھی ایران کو دھمکی کبھی

۴۵ باڑھ پہ تیری جو چڑھا پہلوان — نام کو بھی اس کا نہ چھوڑا نشاں

۴۶ تیری جو ضحاک سے گہری چھنی — قوم کا ہر فرد بنا کشتنی

۴۷ معرکۂ رستم و افراسیاب — تیری بدولت ہوا زیبِ کتاب

۴۸ قتل کا دھبّا ترے دامن پہ ہے — خونِ سیاوش تری گردن پہ ہے

۴۹ خاک اُڑائی یہ تیری آب نے — جان دی ناشاد ہی سہراب نے

۵۰ تو جو طرفدارِ سکندر ہوئی — خاک میں دارا کو ملا کر ہوئی

۵۱ تختِ کیاں کا دیا تختہ اُلٹ | کردی یونان کی کایا پلٹ

۵۲ لشکرِ یوناں کی جلو جب پھری | باختر و بلخ پہ بجلی گری

۵۳ تو نے عرب سے جو کیا اتفاق | فارس و روما کی ہٹی طمطراق

۵۵ شوکتِ ساسان کے ڈیرے لدے | بجھ گئے زردشت کے آتشکدے

۵۶ عرب کی جانب کو جو تو جھک پڑی | شام پہ اک ضرب لگائی کڑی

۵۹ ہاشمیوں کا نہ دیا تو نے ساتھ | آلِ اُمیہ کا پڑا تجھ پہ ہاتھ

۵۸ توڑ دیا روم کا سارا طلسم | رہ گیا بے جان سا مردار جسم

۶۰ ڈھایا ہے کیا تو نے غضب بر ملا | گرم کیا معرکۂ کربلا

۶۳ قہرِ الٰہی سے جو ڈرتی کبھی | مرتی پہ یہ کام نہ کرتی کبھی

۶۴ ہند پہ محمود کی لشکر کشی | یاد دلاتی ہے تری سرکشی

۶۵ بدلی ہوا ایک تیری چال میں | لوٹ پڑی دولت بے پال میں

۶۶ کیا ہی نظر سوز تھی تیری چمک | دھاک تھی کالنجر و قنوج تک

۶۷ یاد ہیں کچھ تجھکو عجب داؤگھات | توڑ دیا بت کدۂ سومنات

۶۸ تو نے ہڑپ کر لئے لاکھوں ہی سر | کم نہ ہوئی پر تری جوع البقر

۶۹ غور سے جس دم تری آندھی چلی | ہند کی سینا میں مچی کھلبلی

۷۰ رائے پتھورا کا وہ جاہ و جلال | ہو گیا پل مارتے خواب و خیال

۷۱ بن گئی ہر بزمِ طرب غم کدہ | دہلی و اجمیر تھے ماتم کدہ

[illegible]

[illegible]

۷۲ سوگ میں رانی نے کیا سینہ چاک — آتشِ سوزاں میں ہوئی جل کے خاک
۷۳ راجہ رہا اور نہ رانی رہی — زیبِ سخن تیری کہانی رہی
۷۴ چونک پڑا فتنۂ جنگِ تتار — لشکرِ چنگیز کا اُٹھا غبار
۷۵ چھا گیا اک ابرِ ستم چار سو — خون کے سیلاب بہے کو بکو
۷۶ کٹ گئے خوارزم و خراساں کے باغ — زمزمہ بلبل کا بنا شورِ زاغ
۷۷ دیلم و بغداد پہ ٹوٹا غضب — درہم و برہم ہوئی بزمِ عرب
طرفہ ستم گار ہے عالم میں تو — عید مناتی ہے محرم میں تو
۷۸ صرصرِ تاراج چلی سر بسر — آگ وہ بھڑکی کہ جلے خشک و تر
۷۹ تیرے ہی کوتک تھے یہ اے نابکار! — کیا کہوں بس تجھ کو خدا کی سنوار
۸۰ کشورِ یورپ سے اُٹھا غلغلہ — وادیِ یردن میں پڑا زلزلہ
۸۱ حربِ صلیبی تھی وہ خونخوار جنگ — ٹوٹ پڑا جس کے لئے کُل فرنگ
۸۲ تو جو برہنہ ہوئی او فتنہ گر! — تن سے جُدا ہو گئے نو لاکھ سر
۸۳ نکلا تجھے لے کے جو تیمورِ لنگ — پھونک دیا چار طرف صورِ جنگ
۸۴ چوس لیا اُس کا خونِ جگر — داب دئے قاف میں دیووں کے سر
۸۵ خون سے گل خاکِ صفاہاں ہوئی — کانپ اُٹھی تختگہِ ہند بھی
۸۶ ناحیۂ شام سے تا حدِّ چیں — مقتلِ انسان بنا دی زمیں
۸۷ تو جو بنی ہمدمِ نیپولین — بول دی یورپ میں صدائے بزن

۸۸ تاجورِ اطراف کے تھرّا گئے — ناک میں ہمسایوں کے دَم آگئے

۸۹ جب ہوئی نادر کی تو زیبِ کمر — خلقِ خدا بول اُٹھی الحذر

۹۱ اُسکی یہ حالت ہوئی زار و زبوں — کوچۂ و برزن میں بہی جوئے خوں

۹۲ کیجئے القصّہ کہاں تک بیاں — فردِ مظالم ہے تیری داستاں

۹۴ میری غرض تیری فضیحت نہیں — بلکہ بجز پند و نصیحت نہیں

۹۵ تند تھی ازبسکہ صریرِ قلم — سُن کے ہوئی تیغِ دودم بھی علم

۹۶ آتشِ غیظ اُس کی بھڑکنے لگی — بجلی کی مانند کڑکنے لگی

۹۷ ڈانٹ کے بولی کہ خبردار ہو! — اب مری باری ہے لے ہشیار ہو!

۹۸ بد ہوں خدا جانے کہ ہوں نیک میں — رکھتی ہوں دل اور زباں ایک میں

۹۹ مجھ کو دورنگی نہیں بھاتی ذرا — میل ملاتی نہیں کھوٹا کھرا

۱۰۰ مہر ہو تو مہر جو کیں ہو تو کیں — یک جہتی ہے مِرا آئین و دیں

۱۰۱ بات کی ہرگز نہیں زنہار پیچ — میرا خمیر اور مِرا کس بل ہے ہیچ

۱۰۲ مجسّمِ قاطع ہوں میں سرتاپا — چھوڑتی باقی نہیں تسمہ لگا

۱۰۳ جبکہ نہ ہو فصلِ خصومت بہم — میرے سوا کون بنے واں حَکَم

۱۰۴ عیب کہو میرا اسے یا ہنر — فیصلہ دو ٹوک اِدھر یا اُدھر

۱۰۵ تیری طرح کا ہے کو باتیں گھڑوں — لڑنے پہ آؤں تو میں سنمکھ لڑوں

۱۰۶ خوب کیا تو نے نکالی جو چھیڑ — دونگی ابھی میں ترے بخیے اُدھیڑ

۱۰۷ جنگ کا بوتی ہوں اگر بیج میں سینچ کے پھر اس کو بتدریج میں

پود بڑھاتی ہوں وہ نعم البدل
۱۰۸ رِفق دُمدار کے لگیں جس میں پھل

(۵۳) شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی! اے زندگانی! بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحظہ جاری جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہے تو یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چھپ چھپاتی ہر دم رواں ہے؟ آتی کہاں سے جاتی کہاں ہے؟
ظاہر ہیں یوں تو سب پر ترے گن لیکن نہ پایا تیرا سرو بن
گزرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے جاہل ہیں تیرے سرِّ نہاں سے
فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے
اے زندگانی! اے شمعِ ہستی! سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی چھائی اندھیری ناگاہ اٹھی اک ڈیک تیری
وہ ڈیک تھی بس نورٌ علےٰ نور کا ہے کو رہتی پردہ میں مستور
پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ

کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں! گویا لگا دی دَوں خشک بن میں
بزمِ جہاں میں رونق ہے تجھ سے اِس میکدہ میں ہُو حق ہے تجھ سے
ہے تیرے دم سے اے عالم آرا! بزمِ عروسیِ آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادوگری میں ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا دے دے کے چھینٹے اُس کو اُبھارا
بے حِس کو بخشا احساس تو نے دی مُشتِ گِل کو بو باس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی ہنگم تو نے سکھایا اُس کو خم وچم
کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر کُندن سے نکلی رنگت بدلکر
ٹھکرا کے تو نے جب کہدیا "قُم" اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی پھرتی ہے خوش خوش کیا الٰہی کھلی
پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ ہوتی ہے پیدا اک گُدگُداہٹ
مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
کہتی ہے دنیا "تو ہے تو کیا غم تو آئے بِن بِن تو آئے چھم چھم"
جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر سب کچھ تصدّق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے تو ہی نہ ہو تو سب پر دھتا ہے
اے سب کی پیاری سب کی چہیتی کہہ مُنہ زبانی کچھ آپ بیتی
قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں ناز و نِعَم سے برسوں پلی ہوں
تقویمِ احسن میرا لگن تھا فردوسِ اعلیٰ میرا وطن تھا
حور و مَلک کی آبادیاں تھیں بے فکریاں تھیں آزادیاں تھیں

چلتی تھی ہردم بادِ بہاری — شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی — سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قدسی
تکریم میری ہوتی تھی از حد — ہیں داستانیں جس کی زبانزد
پھر دیس چھوٹا گزری سو جھیلی — پردیسیوں کا اللہ بیلی!
پَل مارنے کا ہے یاں بسیرا — حُبِّ وطن ہے ایمان میرا
آب و ہوا میں دشت و جبل میں — میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں — ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت سے طاری — مستی میں گُم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزہ میں آئی — کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں مُنہ کھول ڈالا — پَر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں — اِک شور اُٹھا اِس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا — اللہ رے میں کیا میرا کہنا!
کس کس جتن سے میں نے بنایا — رُتبہ بہ رُتبہ پایہ بہ پایہ
جامد کو نامی نامی کو حیواں — حیواں کو وحشی وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا — شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے — جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جس کو نچایا — وہ ناچتے ہی اُس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم — ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے — دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے

مجھکو نہ سمجھو تم آج کل کی
ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی

رکھوں گی جاری یونہی سفر میں
قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں
کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں

سنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دُنیائے فانی"

(۵۴) مثنوی فی العقائد[۵]

ذاتِ حق اپنے آپ ہے موجود
کوئی اُس کے سوا نہیں معبود

اُس کا جوڑا نہیں مثال نہیں
اُس کو گھاٹا نہیں زوال نہیں

اُس کا جو وصف ہے سو کامل ہے
نہ کسی سے جدا نہ شامل ہے

اُس کا ساجھی نہیں شریک نہیں
اور کو مانئے تو ٹھیک نہیں

جانتا ہے وہ آن ہوئی باتیں
دیکھتا ہے ڈھکی چھپی گھاتیں

ہے وہ بے آنکھ دیکھتا سب کو
ہے وہ بے کان سُنتا مطلب کو

اپنی مرضی سے کام کرتا ہے
بے زباں وہ کلام کرتا ہے

اونگھتا ہے کبھی نہ سوتا ہے
سب ارادہ سے اُس کے ہوتا ہے

وہ قوی ہے کبھی نہیں تھکتا
وہ ہر اِک چیز کو ہے کر سکتا

زندہ ہے زندگی کا مالک ہے
جو ہے اُس کے سوا سو ہالک ہے

کہہ سکے کون اُس کو کیسا ہے
آپ ہی جانتا ہے جیسا ہے

[۵] مرتبہ ۱۸۸۸ء بمقام میرٹھ

اُس نے یہ آسماں بنایا آپ
اُس نے فرشِ زمین بچھایا آپ

کیئے اونچے پہاڑ اُس نے کھڑے
میخ کی طرح جو زمیں میں گڑے

اُس نے بادل سے بوند ٹپکائی
اُس نے پانی پہ ناؤ تیرائی

مُردہ مٹّی میں اُس نے ڈالی جان
لہلہائے ہرے بھرے میدان

ہے مسلّم اُسی کو سلطانی
عرشِ اعظم ہے تختِ ربّانی

ہے وہی۔ تھا وہی۔ وہی ہوگا
کون اُس کی برابری جوگا

جس کو چاہے کرے وہ ملیا میٹ
نہیں اُس کو کسی سے لاگ لپیٹ

اُس نے پیدا کیا ہے عالم کو
آسماں کو زمین کو ہم کو

اُس کا احسان و فضل ہے دن رات
اُس پہ واجب نہیں ہے کوئی بات

اُس نے دُنیا میں انبیا بھیجے
اپنے رستہ کے رہ نما بھیجے

خاتمِ انبیا محمدؐ ہے
جس کا احسان ہم پہ بے حد ہے

اُس نے حکمِ خدا کیا تلقین
تھا وہ اللہ کا رسولِ امین

اُس نے تعمیلِ حکم کر دی ہے
ٹھیک ہے اُس نے جو خبر دی ہے

دل سے مانو جو عقل بینا ہے
کہ موئے بعد پھر بھی جینا ہے

زندگی جس نے دی ہے اوّل بار
دوسری بار دے تو کیا دشوار

بعد مرنے کے حشر کا ہونا
ہے مثال اُس کی جاگنا سونا

اُس کی ہستی سے سب کی ہستی ہے
خلقت اُس کی بسائی بستی ہے

اُس نے یہ آسماں بنایا آپ | اُس نے فرشِ زمین بچھایا آپ
کیئے اونچے پہاڑ اُس نے کھڑے | میخ کی طرح جو زمیں میں گڑے
اُس نے بادل سے بوند ٹپکائی | اُس نے پانی پہ ناؤ تیرائی
مُردہ مٹّی میں اُس نے ڈالی جان | لہلہائے ہرے بھرے میدان
ہے مسلّم اُسی کو سلطانی | عرشِ اعظم ہے تختِ ربّانی
ہے وہی۔ تھا وہی۔ وہی ہوگا | کون اُس کی برابری جوگا
جس کو چاہے کرے وہ ملیا میٹ | نہیں اُس کو کسی سے لاگ لپیٹ
اُس نے پیدا کیا ہے عالم کو | آسماں کو زمین کو ہم کو
اُس کا احسان و فضل ہے دن رات | اُس پہ واجب نہیں ہے کوئی بات
اُس نے دُنیا میں انبیا بھیجے | اپنے رستہ کے رہ نما بھیجے
خاتمِ انبیا محمّد ہے | جس کا احسان ہم پہ بے حد ہے
اُس نے حکمِ خدا کیا تلقین | تھا وہ اللہ کا رسولِ امین
اُس نے تعمیلِ حکم کردی ہے | ٹھیک ہے اُس نے جو خبر دی ہے
دل سے مانو جو عقل بینا ہے | کہ موئے بعد پھر بھی جینا ہے
زندگی جس نے دی ہے اوّل بار | دوسری بار دے تو کیا دشوار
بعد مرنے کے حشر کا ہونا | ہے مثال اُس کی جاگنا سونا
اُس کی ہستی سے سب کی ہستی ہے | خلقت اُس کی بسائی بستی ہے

(۵۴) حمدِ باری تعالیٰ

خدایا اوّل و آخر بھی تو ہے
خدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے

وہ اوّل تو کہ ہے آخر سے آخر
وہ آخر تو کہ ہے اوّل سے فاخر

وہ اوّل تو کہ نا محرم بدایت
وہ آخر تو کہ ناپیدا نہایت

نہیں اوّل کو آخر سے جدائی
ورائے عقل ہے تیری خدائی

جو آخر ہے وہی اول بھی تھا تو
وہی جو آج ہے سو کل بھی تھا تو

ہے تیرا اوّل و آخر مطابق
نہ تیرے ساتھ لاحق ہے نہ سابق

جو اوّل ہے تو پہلے اور تھا کون
جو آخر ہے تو پیچھے رہ گیا کون

جو باطن ہے تو باطن کا پتا کیا
جو ظاہر ہے تو ہے تیرے سوا کیا

ہے تو باطن میں ظاہر بلکہ اظہر
بظاہر بن گیا تو عینِ مظہر

ترا اخفا ہے گویا عینِ اظہار
ترا اظہار ہے اخفائے اسرار

کھُلا جتنا ہوا اُتنا ہی مستور
چھپا جتنا رہا کھُلتا بدستور

ازل سے تا ابد ہے ایک ہی شان
ترا طغرا ہے الآن کما کان

مبرّا قید اور اطلاق سے تو
منزّہ انفس و آفاق سے تو

مگر مطلق میں ہے تو عینِ مطلق
نہ جامد ہے نہ مصدر ہے نہ مشتق

مقیّد میں مقید ہے تری ذات
نہیں ہوتا کسی خانہ میں تو مات

ہے اصلِ روح تو روحانیوں میں
ہے قیدِ جسم تو جسمانیوں میں

اگر ناسوت میں ہی موجِ پُر جوش
تو ہے لاہوت میں دریائے خاموش

اگر جبروت میں بانگِ انا ہے
صفِ ارواح میں حمد و ثنا ہے

تو ہی ہے علم و عالم بلکہ معلوم
تو ہی ہے رحم و راحم بلکہ مرحوم

تجھے نسبت ہے لاشے سے نہ شے سے
غنی ہے تو نہیں سے اور ہے سے

تری وحدت میں کثرت ہے نمودار
کہ ہے کثرت نہیں وحدت کا اظہار

نہ ہو وحدت تو کثرت بھی عدم ہے
حدوثِ آئنہ حُسنِ قدم ہے

زمین و آسماں کا نور ہے تو
مگر خود ناظر و منظور ہے تو

سوا تیرے نہیں موجود کوئی
نہ عابد ہے نہ ہے معبود کوئی

ازل سے دائم المعروف ہے تو
ابد تک خود بخود موصوف ہے تو

تری رحمت ہے یہ جلسے دکھاتی
ہے قہاری تری سب کو مٹاتی

مسلّم ہے تجھی کو حکم رانی
کہ تیری سلطنت ہے جاودانی

ہوالموجود ہے تجھ سے عبارت
ہوالمقصود ہے تجھ سے اشارت

احد ہے تو نہیں زنہار معدود
صمد ہے تو نہ والد ہے نہ مولود

عیاں دیکھا تو پہونچا غیب ہو میں
نہاں ڈھونڈا تو آیا رنگ و بو میں

نہ پایا ہے نہ پائے گا کبھی تو
کہ ہے معروف و عارف آپ ہی تو

تصوّرِ قرب کا دوری ہے تجھ سے
خیالِ بُعد مجبوری ہے تجھ سے

نہ دوری ہے نہ نزدیکی نہ مابین — عبارت منقطع لاغیر و لا عین
حقیقت سے نہیں ہے کوئی آگاہ — مشبِّہ اور موحِّد سب ہیں گمراہ
نہ ہو جب فرق ہی تو راہ کیوں ہو — نہ ہو کوئی تو پھر آگاہ کیوں ہو
پتا لگتا نہیں تنزیہ میں بھی — خبر ملتی نہیں تشبیہ میں بھی
یہ ہنگامہ اور اُس پر بے نشانی — ہوا ہے عقلِ کل کا خون پانی
تیمم کر کہ خاکستر ہے دریا — لگا غوطہ کہ ہے گرداب صحرا

نہ صحرا ہے نہ دریا ہے نہ میں تو
نہ یا دو بود باقی ہے نہ ہا ہو

(۵۶) یادِ حضرتِ شیخ

لب پہ آیا نامِ شہِ غوث علی — بے تکلف کھِل گئی دل کی کلی
پھر صبا سبزہ کو لہرانے لگی — باغِ معنی میں بہار آنے لگی
پھر لگا دی ابرِ رحمت نے جھڑی — پھر وہی بادِ بہاری چل پڑی
پھر وہی محمل وہی ہے کارواں — ناقہ سرمست و حدیٰ خواں ساربان
پھر اُسی منزل میں جا کھولی کمر — دشت چٹیل اور ویرانہ نگر
پھر کھلا درِ حجرۂ انوار کا — قفل ٹوٹا قبۂ اسرار کا
پھر وہی صحبت وہی لیل و نہار — پھر لگے ہونے درِ معنی نثار

پھر خزانہ غیب کا لٹنے لگا
رشک سے حاتم کا دم گھٹنے لگا

پھر لگی سانچے میں ڈھلنے بات بات
عارفانہ رمز و مردانہ نکات

پھر الاپے لے نے نے اسرارِ قدم
ذرّہ ذرّہ بن گیا منصور دم

پھر وہی ساغر وہی بزمِ سرور
پھر لگا بہنے وہی دریائے نور

پھر وہی ساقی وہی دیرینہ خم
کفر و ایماں کا ہوا سررشتہ گم

ہو گئے مِل جُل کے سب پھر ایک شے
دورِ ساغر دستِ ساقی مستِ مے

مدحِ حاضر میں بھی لکھ اب چند بیت
تو ہی لکھ خود مَا رَمَیتَ اِذْ رَمَیت

اے تجلّیِٔ اخیرِ ذو الجلال
تھا کمالِ بندگی تیرا کمال

ہاں محمدؐ وارثِ نامِ خدا
کر گیا ہے بندگی کا حق ادا

ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ جاں
قول و فعل و حال سے تیرے عیاں

خوب توڑا تو نے ہر بندِ کہن
تھا مگر توحید رشد رِ خیبر شکن

ہر توسّل سے تجھے اعراض تھا
شیر خوارِ مبدأ فیاض تھا

دادِ حق تھی تیری قوّت اور قوت
تھا خیالِ غیر بیتِ عنکبوت

فقرِ فخری کی صدا بھائی تجھے
حق نے بخشی ارثِ آبائی تجھے

مدتوں کے بعد ایک آدم بنا
ہفت خوانِ فقر کا رستم بنا"

شاذ و نادر کوئی شہبازِ جلال
کھولتا ہے اس ہوا میں پر و بال

شیخ و صوفی رند و زاہد پارسا
سیکڑوں ہیں پر کہاں مردِ خدا

غوثِ اعظم یا جنید و بایزید | یا نظام الدین یا بابا فرید
یا معین الدین و عطّار و شہاب | اپنے اپنے وقت کے تھے آفتاب
مجمع البحرین تجھ سا بعد ازاں | گردشِ دوراں نے دیکھا تھا کہاں
اے محیطِ اولین و آخرین | آفریں! صد آفریں!! صد آفریں!!!
ذات کا آئینۂ کامل بنا | یہ امانت تھی کہ تو حامل بنا
حامل و محمول میں یاں فرق کیا | شمسِ ربانی کو غرب و شرق کیا
تھا نہایت معتبر پکّا امیں | تیرا پیمانہ کبھی چھلکا نہیں
ظرفِ عالی بسکہ دریا نوش تھا | خم کدے خالی کیے پر ہوش تھا
اے تری آواز آوازِ خدا | اور خاموشی تری رازِ خدا
تھے لبِ شیریں لبِ دریائے ذات | اس لیے ہر بات تھی آبِ حیات
جو حکایت جو مثل جو بات تھی | عالمِ معنی کی اک سوغات تھی
مردہ روحوں کے لیے تھی زندگی | زندگی وہ جس کو ہو پائندگی
تیرے دم سے حشرِ روحانی ہوا | صاف و صیقل گوہرِ کانی ہوا
صور پھونکا تو نے جس کی جان میں | جو ہوا سو ہو گیا اک آن میں
جذبِ حق ہو سعیِ طالب سے غلط | چشمِ حق بیں کا اشارہ تھا فقط
جس کسی پر تو نے کچھ پھونکا فسوں | اک نہ اک دن اس کو ابھرے گا جنوں
رسم و عادت کا گریباں پھاڑ کر | دینِ تقلیدی سے دامن جھاڑ کر

کفر پر یاروں کے ایماں لائے گا
وار مردوں کا نہ خالی جائے گا

اے مقلد تجھ کو ایماں کی قسم!
کافرِ دیرِ فنا کے لے قدم

جو نہ دے تجھ کو کھُلا کافر بنا
تو مری تکفیر کا محضر بنا

فقر کو ہے کفر سے نسبت قوی
ہے مگر وہ کفر کفرِ معنوی

فقر محتاجِ خدا ہرگز نہیں
فقر عینِ ذاتِ حق ہی بالیقین

ہی یقین بھی عینِ یکتائی میں عار
فقر سے بھی چاہیے پھر افتقار؟

فقرِ فقر آیا تو کیا باقی رہا
بادہ کش باقی نہ خود ساقی رہا

سر گیا تو دردِ سر جاتا رہا
اُٹھ گئی اُمید ڈر جاتا رہا

اے فنا اے فقر تجھ کو مرحبا
عینِ عریانی ہے بس تیری عبا

مرحبا اے خازنِ اسرارِ غیب
کیا چھپایا ہے ہنر کو مثلِ عیب

ہاں خزانہ کا چھپانا فرض تھا
گرچہ بیرونِ سما و ارض تھا

یہ چھپانا کم نہ تھا اظہار سے
آگ بھڑکی گرمیِ بازار سے

وہ چھپے کیا جو کہ ہو خود پردہ در
باہمہ بے پردگی ہو مستتر

دیکھ کیا کہنا تھا کیا کہنے لگا
نالہ بل کھا کھا کے کیوں بہنے لگا

کچھ نہ تھا واں کچھ نہ ہونے کے سوا
کچھ نہ ہونا بھی وہاں باقی نہ تھا

تو نہ تھا کچھ عینِ عین اللہ تھا
ظاہرا بندہ نہانی شاہ تھا

بندگی کے بھیس میں اے جامہ زیب
دے گیا واللہ تو سب کو فریب

تجھ کو دیکھا پر نہ دیکھا خلق نے | لب نے چکھا پر نہ کھایا حلق نے
تو دھنتّر بید تھا کھاتے اگر | سب دھنتّر بید بن جاتے مگر
کس کی طاقت تھی کہ تجھ کو دیکھتا | لاکھ پردوں میں ہیں خاصانِ خدا
سب گنوں میں تو فریدِ دہر تھا | جاں فزا امرت سے تیرا زہر تھا [توحید۱۲]
تو قلندر رند تھا کونین سوز | سیف قاطع تھا نہ تھا تو بخیہ دوز
تو بھری محفل میں سب کچھ کہہ گیا | گوشِ جاں میں کہہ جو باقی رہ گیا
مَنْ رَّاٰنی کے معانی صاف صاف | شرح فرما تو ہی اے عنقائے قاف
مَنْ رَّاٰنی منہ زبانی جس کی ہے | ہے اُسی کا آئنہ ہر ایک شے
تو ہی خود کہہ یا نہ کہہ سن یا نہ سن | لوٹ ہے جب آسماں برسائے مَن
سطح پر جاری ہے ساری لہر بہر | قعر میں چپ رہ کہ ہے دریائے قہر
سطح کیسی قعر کیا ساحل کجا | بحر ہے لا ابتدا لا انتہا
تیری مجلس مجلسِ اللہ تھی | دونوں عالم کی جہاں گُم راہ تھی
اُس کے ہوتے ہستیٔ عالم کہاں | دن نکل آیا تو پھر شبنم کہاں
آپ غالب ہے وہ اپنے امر پر | لیکن اکثر آدمی ہیں بے خبر
تا لبِ دریا ہیں آثار و طریق | عین دریا میں ہیں سب راہیں غریق
راہ گُم ہونا ہے راہِ مستقیم | حاش للہ ثم باللہ العظیم
آپ کو گم کر کہ تو ہی راہ ہے | راہ کو طے کر حریم شاہ ہے

(۵۷) صفتِ شیخ

شیخ کہتے ہیں اُسے جو پیر ہو
بال بال ایسا کہ جوئے شیر ہو

کچھ نہ باقی ہو سیاہی کی جھلک
بن گیا ہو برف سر سے پانو تک

وہ سیاہی کیا ہے؟ اوصافِ بشر
مونچھ داڑھی کی سیاہی سے نہ ڈر

مونچھ ڈاڑھی یا سیہ ہو یا سفید
ہو نہ ہو یاں کچھ نہیں اس کی بھی قید

ہے سیہ بالوں سے ہستی مدعا
پیر ہے وہ جس نے دی ہستی مٹا

چھٹ گیا جو ہستیِ موہوم سے
مسندِ پیری پہ بیٹھا دھوم سے

اور اگر باقی ہے ہستی بال بھر
پیرِ نابالغ ہے وہ یعنی بشر

جس میں اوصافِ بشر کی ہے لتھیڑ
شیخ وہ ہرگز نہیں اِلّا ادھیڑ

کھچڑی داڑھی نہیں مقبولِ حق
ہے ابھی تک اُس میں ہستی کی رمق

جب نہ ہو باقی رُواں کوئی سیاہ
تو سمجھیے اُس کو شیخِ دیں پناہ

لا کی کنگھی کھچڑی داڑھی میں کر
تاکہ پرِّ زاغ ہوں بگلے کے پر

(۵۸) مناجات[۱]

خداوندگارا جہازِ جہاں　ہے تیری مشیّت کی رو میں رواں

سمندر ہے قدرت کا تیری بڑا　اور اُس بحر میں یہ سفینہ پڑا

ہم اُس میں سفر ختم کرتے ہوئے　مسافر ہیں چڑھتے اُترتے ہوئے

تو ہی اُس سفینہ کا ہے ناخدا　ہمارے تردّد سے ہوتا ہے کیا

ترے حکم سے گرمِ رفتار ہے　مسافر کا اندیشہ بے کار ہے

جدھر تو جھکائے اُدھر وہ جھکے　جہاں روک دے تو وہاں وہ رُکے

جو ملّاح تو ہے تو گھبرائیں کیوں؟　نگہبان تو ہے تو چلّائیں کیوں؟

نہیں موج و طوفان کا کچھ خطر　کہ تو آپ ہے راہ رو راہ بر

ازل سے ابد تک ہے بس تو ہی تو　ترا جلوہ ہے عالمِ رنگ و بو

نہ ہوتا اگر تیرا لطفِ نہاں　تو ہم بزمِ ہستی میں ہوتے کہاں

ہیں تیری حمایت میں محفوظ سب　ہیں تیری عنایت سے محظوظ سب

نہ تھا عہدِ طفلی میں کچھ بھی وقوف　تو ہی پالتا تھا ہمیں اے رؤف

سبھی آفتوں سے بچایا ہمیں　کھلایا پلایا بڑھایا ہمیں

دیئے تو نے ماں باپ کیسے شفیق　مہیّا کیے تو نے کیا کیا رفیق

۱؎ بفرمائش مولوی کریم بخش صاحب ڈپٹی کلکٹر مرحوم ۱۲

ہماری نہ کوشش نہ تدبیر تھی | ترا حکم تھا تیری تقدیر تھی
مگر جب سے پیدا ہوا کچھ شعور | تو جمعیّتِ دل میں آیا فتور
غلط کار تھی یہ ہماری نظر | کہ ہم اپنی کوشش کا سمجھے اثر
ہمارے تشخص نے کھویا ہمیں | ہماری خودی نے ڈبویا ہمیں
پڑے حرصِ دنیا کے گرداب میں | رہے مبتلا اس شکر خواب میں
تردّد میں غوطے لگایا کیے | تصوّر میں شکلیں بنایا کیے
ہوا ہم کو دیوانگی کا خلل | یہ تھوڑی سی فرصت یہ طولِ امل
نہ سمجھا کبھی ہائے اپنا حساب | کہ ہم موج ہیں بحر ہیں یا حُباب
کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے | جئیں گے کبھی کل تک کہ مر جائیں گے
یہ دُنیا کے دھندے معیشت کا غم | یہ دولت کے چسکے یہ جاہ و حشم
یہ عزّت کی خواہش یہ راحت کی چاہ | ہمارے لئے بن گئیں سنگِ راہ
تعلّق کے پھندوں میں ہم پھنس گئے | تکلّف کی دلدل میں ہا ہم دھنس گئے
ہمیں نفس نے سخت دھوکا دیا | نہ کرنا تھا جو کام ہا ہم نے کیا
گئی رائیگاں مفت عمرِ عزیز | نہ کی چیز ناچیز میں کچھ تمیز
گیا وقت اور ہاتھ آیا نہ کچھ | بہت کھو کے بھی ہم نے پایا نہ کچھ
یہ دنیا کہ دھوکے کی ٹٹّی ہے سب | ہمیشہ رہی ہا ہم کو اِس کی طلب
دیا مسِّ خالص کو مٹّی کے بھاؤ | بگڑنے کو سمجھا کیے ہم بناؤ

جیسے عیش سمجھے تھے نکلا عذاب — جیسے آب سمجھے تھے پایا سراب
دیئے بے بہا لعل ہم نے فضول — عوض میں لیا کیا، یہی خاک دھول
جواہر دیئے سنگ ریزے لئے — نکمّے کیئے کام جتنے کیئے
مگر بھیس میں گُل کے آیا تھا خار — خزاں بن کے آئی تھی فصلِ بہار
جسے اصل سمجھے تھے بے اصل تھا — جسے وصل سمجھے تھے وہ فصل تھا
یہ تھا مرحلہ جس کو سمجھے تھے گھر — مُہیّا کیا کچھ نہ زادِ سفر
کٹی عمر غفلت میں اپنی تمام — گیا دن گزر ہونے آئی ہے شام
پڑے بے خبر ہائے سوتے رہے — عبث نقدِ اوقات کھوتے رہے
کھُلا بھید ہم کو نہ اس بات کا — کہ ہے یہ تماشا طلسمات کا
نہ سمجھے کہ ہے شعبدہ یہ جہاں — نیا سانگ ہوتا ہے ہر دم یہاں
توہّم نے رستہ بھلایا ہمیں — کہ فانی کو باقی دکھایا ہمیں
یہ تیری ہی قدرت کا نیرنگ ہے — کہ نابود میں بود کا ڈھنگ ہے
سُنے اس چمن میں عجب چہچہے — کہ چلتے مسافر کھڑے ہو رہے
ہے اُستادِ کامل کی بازی گری — کہ خالی تھی مٹھی دکھا دی بھری
ہوس نے مچائی عجب دھوم دھام — سفر کو سمجھنے لگے ہم قیام
عجب نیستی نے دکھائی بہار — کہ پھولوں کے بدلے چُنے ہم نے خار
گیا قافلہ دور ہم چھٹ گئے — چلے ایسے رستے کہ بس لٹ گئے

[illegible]

بسا اپنے کانوں میں ہے ایسا رس
سنائی نہ دی ہم کو بانگِ جرس

کیا ناتوانی نے اب چور چور
ہوا وقت ناوقت منزل ہے دور

سفر کیونکہ تنہا کروں رات میں
لگے چور ہیں ہر طرف گھات میں

جو ٹھیروں تو بستی ہے بالکل اُجاڑ
کھنڈرا اور ویرانہ جنگل پہاڑ

نہ رہنے کا یارا نہ چلنے کی تاب
خداوندگارا! خبر لے شتاب

خدایا! نہیں کوئی جائے پناہ
مگر تیرا در اور تری بارگاہ

خدایا! کوئی یار و یاور نہیں
مگر تو کہ موجود ہے ہر کہیں

خدایا! نہیں ہے کوئی چارہ گر
مگر تو کہ ہے تجکو سب کی خبر

خدایا! نہیں ہے کوئی دستگیر
مگر تو کہ ہے تو سمیع و بصیر

خدایا! نہیں ہے کوئی غمگسار
مگر تو کہ ہے سب کا پروردگار

ازل میں نہ تھا میں نہ میری دُعا
ترا لطف تھا اور تیری عطا

دیا جسم بھی تو نے اور جان بھی
دیا زندگانی کا سامان بھی

کیا تو نے آراستہ یہ مکاں
بُلایا کرم سے ہمیں میہماں

کیا میہمانی کا سامان خوب
مرتب کیا خوانِ الوان خوب

ہوائے لطیف اور آبِ زُلال
دیے اپنے مہمان کو بے سوال

دیے خاک نے کیا ذخیرے اُگل
خوش آئندہ پھول اور پسندیدہ پھل

دیے جس نمونہ کے دانے بکھیر
اُسی جنس کا لگ گیا ایک ڈھیر

یہ عمدہ غذا اور فاخر لباس
یہ رہنے کو ایوانِ محکم اساس

بتانے کو رستہ دیے راہ بر
بُلایا جنھوں نے تری راہ پر

نہ تھا کوششوں کا ہماری صلہ
عنایت سے تیری مِلا جو مِلا

دیا تو نے کیا کچھ بغیر التماس
غرض تیرے الطاف ہیں بے قیاس

بحاجت سے خاموش کیونکر رہوں میں
کہ تیری عنایت کا خوگر ہوں میں

بھلا اب کروں وہم و وسواس کیوں
قبولِ دعا کی نہ ہو آس کیوں

شہنشاہ کا جب کرم عام ہو
تو درویش کو کیوں نہ ابرام ہو

وہ غم دے کہ ہو جائیں سب غم غلط
نہ ہو اور کچھ تو ہی تو ہو فقط

نہ کچھ فکرِ شادی و غم کا رہے
نہ کچھ دغدغہ بیش و کم کا رہے

چلیں شادی و غم کے جھونکے ہزار
مرے دل کو جنبش نہ ہو زینہار

اگر غرقِ طوفاں ہو کُل کائنات
نہ پھسلے کبھی میرا پائے ثبات

ترے لطف کا ہو سہارا اگر
تو غالب ہو تنکا بھی سیلاب پر

جو تیری حمایت کا فانوس ہو
تو آندھی سے کیا خوف ہے شمع کو

اگر فضل کا تیرے لنگر ملے
تلاطم سے ہرگز نہ کشتی ہلے

جو ہو بادباں تیری تائید کا
دبے پاؤں پلٹے مخالف ہوا

جو تیری مدد ناخدائی کرے
تو پھر کوئی طوفان سے کیوں ڈرے

مرے دل پہ برسادے ایسی پھُہار
کہ دب جائے غفلت کا گرد و غبار

مرے دل کو اوہام سے پاک کر
مجھے اپنے رستہ میں چالاک کر
تیقّن کا یارب نکال آفتاب
توہّم کا دل سے اُٹھا دے حجاب
ترے عشق سے گرم سینہ رہے
نہ مرنا رہے اور نہ جینا رہے
کہوں دردِ دل کس سے اے بے نیاز
نہیں کوئی تیرے سوا چارہ ساز
جلا دے معاصی کے سب خار و خس
ہے نارِ محبت کا اک شعلہ بس
خدایا وہ کامل نظر دے مجھے
کہیں ذرّہ ذرّہ میں دیکھوں تجھے
مرے سر کو تسلیم کا تاج دے
مجھے قرب کی اپنے معراج دے
ریاضِ رضا کی دکھا دے بہار
شکایت کا دل سے مٹا دے غبار
رہے کچھ نہ فکرِ کثیر و قلیل
پڑھوں حسبی اللہ نعم الوکیل
مجھے صبر دے جو کبھی کم نہ ہو
بلاؤں کے حملہ کا کچھ غم نہ ہو
خدایا عطا کر وہ نیّت کھری
طمع سے منزّہ ریا سے بری
مجھے صدق دے حسنِ اخلاص دے
مجھے فضل کا خلعتِ خاص دے
مرے عزم کو شوق کے پر لگا
کہ دوں بازیِ عشق میں سر لگا
تمنّا ہے جب تک رہے دم میں دم
طلب میں رہوں تیری ثابت قدم
میں سوؤں تو سوؤں تری فکر میں
میں جاگوں تو جاگوں ترے ذکر میں
لگا دے مرے منہ سے وہ جام پاک
پڑھے ہر بنِ مو ترا نامِ پاک
رہے دھیان میں کچھ نہ دوزخ نہ بہشت
تری دید بن جائے میری سرشت

مجھے رنگ دے پانو سے تا بفرق | خُمِ صبغۃ اللہ میں کر کے غرق
مرے دل سے زنگِ دوئی دُور کر | مرے دل کو وحدت سے معمور کر
نہ لیلے رہے اور نہ مجنوں رہے | فقط عشق کا ایک مضموں رہے
رہے عشق میں رات دن سوز و ساز | کروں شوق کی میں حکایت دراز
دیارِ محبّت سے چل اے نسیم | سُنگھا دے گُلِ معرفت کی شمیم
گلستاں نہیں پنکھڑی ہی سہی | ہمیشہ نہیں دو گھڑی ہی سہی
سنا دے طیورِ صفا کی چہک | گلِ معرفت کی اُڑا لا مہک
نکالوں کلیجہ سے ہجراں کا خار | ملوں مُنہ پہ گلگونۂ وصلِ یار
یقیں کی لپٹ سے بسا دے دماغ | طریقِ وطن کا لگا دے سراغ
قفس میں کرے تا بکے اعتکاف | کرا دے حطیمِ چمن کا طواف
لگے روضۂ اُنس کی جب ہوا | تو ہوں پچھلے شکوے گلے سب ہوا
ہوا و ہوس دل سے برباد ہو | ترا شغل ہو اور تری یاد ہو
نہ ساغر رہے اور نہ ساقی رہے | سوا تیرے کوئی نہ باقی رہے
نگاہوں میں ہو جلوہ گر تو ہی تو | ہر اِک گل میں پاؤں ترا رنگ و بو
کروں فہم تجھ کو ہر اک بات سے | سنوں تیرا نغمہ جمادات سے
چڑھے جامِ وحدت کا ایسا خمار | کہ اغیار سمجھوں کسی کو نہ یار
کہوں اور سنوں خود بنوں چشم و گوش | مری بیخودی پر ہوں قربان ہوش

ترا جلوہ دیکھوں نہاں اور عیاں
نہ پائے مگر مجھ کو میرا نشاں

تری یاد میں محو ہو جاؤں میں
کسی شے کو ڈھونڈوں تجھی پاؤں میں

ملے مجھ کو ہرگز نہ میرا پتا
نہ سمجھوں کہ میں کون تھا اور کیا

ترے بادۂ عشق سے ہو کے مست
سنوں گوشِ جاں سے ندائے الست

رہے ماسوا کا نہ ذرّہ خیال
مجھے ایک ہو جائے ماضی و حال

خلا اور ملا میں نہ ہو وہمِ غیر
کروں بے خودی میں خدائی کی سیر

مرے وصف بن جائیں تیری صفات
مری زیست ہو جائے تیری حیات

یہاں تک میں یکسان و یکسو بنوں
کہ تو میں بنے اور میں تو بنوں

بصارت ہو تیری بصارت میں غرق
سماعت ہو تیری سماعت میں غرق

مری بات بن جائے تیرا کلام
مری چال ہو جائے تیرا خرام

مٹے وہمِ باطل نظر آئے حق
پڑھوں پتّے پتّے سے تیرا سبق

چمک تیری دیکھوں ہر اک سنگ میں
سنوں راگ تیرا ہر آہنگ میں

تری شان پاؤں ہر انداز سے
ترا لہجہ سمجھوں ہر آواز سے

لگا دل پہ دردِ محبّت کی چوٹ
جو پتّا بھی کھڑکے تو میں جاؤں لوٹ

جو بلبل کا نغمہ پڑے کان میں
تو ہو شور برپا مری جان میں

نوا سنج ہو طوطی سبز پر
تو میں اپنی ہستی سے جاؤں گزر

جو شاخوں پہ قمری کی کو کو سنوں
تری یاد میں اپنے سر کو دھنوں

جو گلشن میں دیکھوں کہ ہیں گل کھلے
ترے ذوق میں میری گردن ہلے

کرے چہچہے طائروں کا ہجوم
کروں وجد میں خاک پر جھوم جھوم

جو دیکھوں کہ ملتی ہے شاخِ نہال
گزر جائے پردوں سے میرا خیال

جو دیکھوں میں تاروں بھری رات کو
کروں دل سے ساقط اِضافات کو

چمکتے ہوئے دیکھ کر مہر و ماہ
کروں پیرویِ خلیلِ الٰہ

رہِ راست کی کر ہدایت مجھے
سلامت روی کر عنایت مجھے

غضب سے ترے مانگتا ہوں پناہ
الگ اُن سے رکھ جو گئے بھول راہ

اگر مغفرت سے نہ پیش آئے تو
اگر رحم مجھ پر نہ فرمائے تو

تو میرا ٹھکانا نہیں پھر کہیں
نہ دُنیا نہ عُقبےٰ نہ ایمان و دیں

مجھے اپنی دانش کا ساغر پلا
رہے تشنگی کا نہ باقی گِلا

نہ چھوڑوں گا دامن ترا اے کریم
ترا لطف شامل ہے رحمت عمیم

خدایا مری خواہشوں پر نہ جا
جو تیری رضا ہے وہی ہے بجا

تقاضا مرا سخت معیوب ہے
جو مرضی ہے تیری وہی خوب ہے

تری ذات دانائے اسرار ہے
سبھی نیک و بد سے خبردار ہے

کر اپنی ہی مرضی سے ردّ و قبول
کہ سائل ہے تیرا ظلوم و جہول

وہی خوب ہے جو ہے تجکو پسند
ہو آسودگی ظاہرا یا گزند

جس احوال سے تو رضامند ہے
اگر زہر بھی ہو تو گلقند ہے

بقولِ نظامیِ غفراں مآب
رکھا اپنے ہی قبضہ میں میرا حساب
سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را
کروں کس لئے غم رہوں کیوں اُداس
کہ توشاہ رگ سے زیادہ ہے پاس
زہے قرب تیرا زہے ہمدمی
نہ اُس کو زوال اور نہ اس میں کمی
پتا اپنے ہوتے تری ذات کا
ہے سودا پکانا محالات کا
فناسب کو دیتی ہے اس جا تھپک
کہ کانِ نمک میں نہیں جز نمک
مگر جو نظر میں سمایا ہے یہ
کمالات کا تیرے سایہ ہے یہ
نظر چاہیے اور صفا چاہیے
دل آئینہ ہے دیکھنا چاہیے
کروں مرکزِ قلب پر میں نگاہ
کہ نکلی یہاں سے دو عالم کی راہ
مگر دونوں عالم سے تو پاک ہے
نہ احساس ہے واں نہ ادراک ہے
کروں زمزمہ لے میں شیراز کی
کہ مستانہ دُھن ہے اس آواز کی
رہِ عقل جز پیچ بر پیچ نیست
برِ عارفاں جز خدا ہیچ نیست

(۵۹) غصّہ کا ضبط

دل میں جب کوند جائے برقِ غضب
اور طبیعت ہو انتقام طلب
اس خطرناک راہ میں جو مرد
کر سکے آتشِ غضب کو سرد
ڈانٹ کر دیوِ نفس کو لے تھام
اور نہ لائے زباں پہ سخت کلام

مشورت عقل کی سُنے اُس دم ہے وہی اپنے وقت کا رستم

(۶۰) ادب

ادب ہی سے انسان انسان ہے نہ سیکھے ادب جو وہ حیوان ہے
جہاں میں ہو پیارا نہ کیونکر ادب کہ ہے آدمیّت کا زیور ادب
نہ ہو جس کو اچھّے بُرے کی تمیز نہ وہ گھر میں پیارا نہ باہر عزیز
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب یہ سچ بات ہے۔ بے ادب بے نصیب

(۶۱) چغلخوری

چغلی ہے بڑا کام بچو اِس سے ہمیشہ جو لوگ ہیں بے شرم اُنھیں کا ہے یہ پیشہ
یہ لت ہے بُری۔ اِس سے نہیں ہاتھ کچھ آتا اکثر تو چغلخور ہی ذلّت ہے اُٹھاتا

(۶۲) آزادی غنیمت ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو بھلی اُس محل سے۔ جہاں کچھ خطر ہو

(۶۳) طلبِ خیر میں قناعت سے حرص بہتر ہے

جو طلبِ خیر میں قانع ہوا — اپنی ترقّی کا وہ مانع ہوا
ایسی قناعت سے طمع خوب ہے — حرص ہی اس راہ میں محبوب ہے

(۶۴) تکبّر میں ذلّت ہے اور تواضع میں عزّت

تکبّر کیا ہے ؟ - اِک ایوانِ عالی — مگر ناموس اور عزّت سے خالی
تواضع ایک تہ خانہ ہے جس میں — چھپی بیٹھی ہیں سب عزّت کی قسمیں

—— • (•❋•) • ——

مثلث

اب آرام کرو

جُھٹ پُٹا سا ہو گیا ہے شام کا
اب کہاں باقی ہے موقع کام کا
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

قصد چڑیوں نے بسیرے کا کیا
ڈھونڈتی ہیں اپنا اپنا گھونسلا
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

دیکھنا سورج ہے چھپنے کے قریب
تھم گئے چلتے مسافر بھی غریب
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

لو! کبوتر بھی گرے ہے پر جوڑ کر
لیں گے اپنے چھوٹے بچّوں کی خبر
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

شام کو بستی سے باغوں کی طرف
اُڑ چلے کوّے بھی مل کر صف بہ صف
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

کھلبلی جو دن میں تھی مدّھم پڑی
بھنبھناہٹ مکھیوں کی کم پڑی
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

جانور دن بھر قلانچیں بھر چکے
اپنا اپنا کام پورا کر چکے
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

یہ جو کُٹ کُٹ کر رہی ہیں مرغیاں ڈھونڈتی ہیں اپنے دڑبے کا نشاں
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

بھیڑ۔ بکری۔ اونٹ۔ گھوڑا۔ گاؤ۔ خر آن پہنچے اپنے اپنے تھان پر
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

اب ہوا کے تیز جھونکے رُک گئے سو گئے پیڑ اور پتّے جھک گئے
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

لو سویرے تک ہمارا بھی سلام وقت ہے ناوقت کیا کیجے کلام
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

مربع

اچھّا زمانہ آنے والا ہے

۱

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ بجے گا محبت کا نقّار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

۲

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقّی کیے بِن کرو صبر آتا ہے اچھّا زمانہ

۳

ہر اک توپ سچ کی مددگار ہو گی
خیالات کی تیز تلوار ہو گی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہو گی
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

۴

زبانِ قلم سیف پر ہو گی غالب
دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہو گا دُنیا کا قالب[۱]
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

۵

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا
مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب سے مانے گی دنیا
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

۶

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ڈائن
تفاخر بے ہو گی نہ قوموں میں آن بن
مشیخت کی خاطر اڑے گی نہ گردن
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

۷

عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت
مذاہب کو ہو گی تعصب سے فرصت
مگر اُن کی بڑھ جائے گی ور طاقت
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

---

[۱] اصل میں با لفتح ہے مگر روزمرہ اُردو کا بالکسر ہے۔

۸

کریں سب مدد ایک کی ایک مِل کر
یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اُٹھ جائے چھپّر
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

مخمس

(۱) چھوٹی چیونٹی

بڑی عاقلہ ہے بہت دوربیں ہے
کہ فکر اپنی روزی کا تیرے تئیں ہے
اسی دُھن میں پہنچی کہیں سے کہیں ہے
کبھی اپنے دھندے سے غافل نہیں ہے
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

نہیں کام سے شام تک تجھ کو فرصت
ذرا سی تو جان اور اُس پر یہ محنت
بہت جھیلتی ہے مشقّت مصیبت
نہیں ہارتی پر کبھی اپنی ہمّت
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

کبھی کام تو نے ادھورا نہ چھوڑا
کبھی تو نے تکلیف سے مُنہ نہ موڑا
بہت کام تو نے کیا تھوڑا تھوڑا
ذخیرہ یہ جاڑے کی خاطر ہے جوڑا
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

جو گرمی کی رُت میں نہ کرتی کمائی
تو جاڑے کے موسم میں مرتی بن آئی
تجھے ہوشیاری یہ کس نے سکھائی
سمجھتی ہے اپنی بھلائی بُرائی

اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

نہ کھو وقت سستی میں مہلت ہے تھوڑی
وہی کام کر جس سے مالک ہو راضی
کہ جس نے تجھے زندگانی عطا کی
یہ عمدہ سبق ہم کو دیتی ہے چیونٹی

اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے

(۲) کوشش کئے جاؤ

دکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو
تو دی اس نے بالکل ہی لٹیا ڈبو
نہ بھاگو کبھی چھوڑ کر کام کو
توقع تو ہے خیر جو ہو سو ہو

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل
تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہیں مستقل
تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

یہ مانا کہ مشکل بہت ہے سبق
بڑا ہے مگر اضطراب اور قلق
دوبارہ پڑھو پھر پڑھو ہر ورق
پڑھے جاؤ جب تک ہے باقی رمق

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

اگر طاق میں تم نے رکھ دی کتاب
تو کیا دو گے کل امتحاں میں جواب
نہ پڑھنے سے بہتر ہے پڑھنا جناب
کہ ہو جاؤ گے ایک دن کامیاب

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

نہ تم ہچکچاؤ نہ ہرگز ڈرو　　جہاں تک بنے کام پورا کرو
مشقت اُٹھاؤ مصیبت بھرو　　طلب میں جیو جستجو میں جیو

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو تم شیر دل ہو تو مارو شکار　　کہ خالی نہ جائے گا مردوں کا وار
مشقت میں باقی نہ رکھنا اُدھار　　جو ہمت کروگے تو بیڑا ہے پار

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

نہ بھاگو اگر مشکل آ جائے پیش　　خوشی سے گوارا کرو نوش و نیش
بنو کاہلی سے نہ گو بر گنیش　　وہی دے گا مرہم دیا جس نے نیش

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

جو بازی میں سبقت نہ لے جاؤ تم　　خبردار! ہرگز نہ گھبراؤ تم
نہ ٹھٹکو نہ جھجکو نہ پچھتاؤ تم　　ذرا صبر کو کام فرماؤ تم

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

مقابل میں خم ٹھوک کر آؤ ہاں　　پچھڑنے سے ڈرتے نہیں پہلواں
کرو پاس تم صبر کا امتحاں　　نہ جائے گی محنت کبھی رائیگاں

کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

زیاں میں بھی ہے فائدہ کچھ نہ کچھ　　تمھیں مل رہے گا صلہ کچھ نہ کچھ

ہر ایک درد کی ہے دوا کچھ نہ کچھ
کبھی تو لگے گا پتا کچھ نہ کچھ
کیئے جاؤ کوشش مرے دوستو

تردد کو آنے نہ دو اپنے پاس
ہے بیہودہ خوف اور بیجا ہراس
رکھو دل کو مضبوط قایم حواس
کبھی کامیابی کی چھوڑو نہ آس
کیئے جاؤ کوشش مرے دوستو

کرو شوق و ہمت کا جھنڈا بلند
کو داؤ اولوالعزمیوں کا سمند
اگر صبر سے تم سہوگے گزند
تو کہلاؤ گے ایک دن فتح مند
کیئے جاؤ کوشش مرے دوستو

(۳) میرا خدا میرے ساتھ ہے

ہے ہمیشہ مری خدا پہ نظر
رات ہو دن ہو شام ہو کہ سحر
نہ اُجالے میں ہے کسی کا ڈر
نہ اندھیرے میں کوئی خوف و خطر
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

شام کا وقت یا سویرا ہو
چاندنی ہو کہ گُپ اندھیرا ہو
مینہ نے آندھی نے مجھ کو گھیرا ہو
لیک پرہول دل نہ میرا ہو
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جب کہ طوفان کا ہو سنّاٹا
سخت اندھیاؤ کا چلے جھونکا

جڑ سے پیڑوں کو دے اُکھیڑ ہوا　　میرے دل میں نہ خوف ہو اصلا
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

ٹوٹ کر آسمان سے تارے　　شب کو گرتے ہیں جیسے انگارے
وہم کرتے ہیں لوگ بےچارے　　میں نہ گھبراؤں خوف کے مارے
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

چاند سورج کا دیکھ کر گہنا　　میرے ہمجولیوں کو ہے کھٹکا
لوگ کرتے ہیں خوف کا چرچا　　پر مجھے اس کی کچھ نہیں پروا
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جب ستارہ طلوع ہو دُم دار　　دم ہو ایسی کہ چھوٹتا ہے انار
سب پہ طاری ہوں خوف کے آثار　　میرے بھاویں مگر نہ ہو زنہار
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

میرے رستہ میں ہو اگر میداں　　یا پرانا کوئی کھنڈر سنساں
کوئی مرگھٹ ہو یا ہو قبرستاں　　نہ خطا ہوں وہاں کے مرا اوساں
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

ہو بیابان میں گزر میرا　　یا سمندر پہ ہو سفر میرا
دور رہ جائے مجھ سے گھر میرا　　رہے پھر بھی قوی جگر میرا
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

جب کہ دریا میں آئے طغیانی　　اور ہاتھی ڈباؤ ہو پانی
پار کھیوا نہ ہو بآسانی　　مجھ کو اندیشہ ہو نہ حیرانی
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

لشکروں کی جہاں چڑھائی ہو　　شہ سواروں نے باگ اُٹھائی ہو
اور گھمسان کی لڑائی ہو　　واں بھی ہیبت نہ مجھ پہ چھائی ہو
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

(۴) صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں　　اُجالا زمانہ میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں　　پکارے گلے صاف چلّا رہی ہوں
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں سب کاربہوار کے ساتھ آئی　　میں رفتار و گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی　　میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے　　خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے　　سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی
اِدھر سے اُدھر اُڑ کے ہیں آتی جاتی
دُموں کو ہلاتی پروں کو پھلاتی
میری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں مچائی
تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی
میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے
نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے
مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں
ہر ایک ملک میں دیس میں ہر وطن میں
کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں
بجھاتی چلی شمع کو انجمن میں
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے
سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے
عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہرن چونک اُٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں
کلولیں ہر ایک کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں
غرض میرے جلوہ پہ سب مر رہے ہیں

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں تاروں کی چھاں آن پہنچی یہاں تک
زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤ گے دیکھتے ہو جہاں تک
کرو گے بھلا کاہلی تم کہاں تک

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

پُجاری کو مندر کے میں نے جگایا
مؤذّن کو مسجد کے میں نے اُٹھایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا
اندھیرا گھٹایا۔ اُجالا بڑھایا

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل میں ڈیرے
کسانوں کے ہل چل پڑے مُنہ اندھیرے
چلے جال کندھے پہ لے کر مچھیرے
دِلدّر ہوئے دور آنے سے میرے

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بِگُل اور طنبور سنکھ اور نوبت
بجانے لگے اپنی اپنی سبھی گت
چلی توپ بھی دن سے حضرت سلامت
نہیں خوب غفلت نہیں خوب غفلت

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہوشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو
نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور مُنہ سے بولو
بس اب خیر سے اُٹھ کے مُنہ ہاتھ دھولو

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری
جہاں میں ہوا اب مرا حکم جاری

ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری دکھائی دیئے باغ اور کھیت کیاری

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں پورب سے پچھم پہ کرتی ہوں دھاوا زمیں کے کُرہ پر لگاتی ہوں کاوا
میں طے کرکے آئی ہوں چین اور جاوہ نہیں کہتی کچھ تم سے اس کے علاوہ

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

(۵) خدا قیصرۃ الہند کو سلامت رکھے

عیش وطرب کے ہیں یہاں چرچے کون بھلا جبر کسی کا سہے
کیوں نہ یہ دل سے رعایا کہے جب تک اِس اقلیم میں گنگا بہے

قیصرۃ الہند سلامت رہے

ہند کا اس عہد میں بدلا مزاج عدل نے اس دور میں پایا رواج
جملہ مفاسد کا ہوا ہے علاج سب کی تمنّا ہے کہ با تخت و تاج

قیصرۃ الہند سلامت رہے

بس کہ رعایا پہ ہے وہ مہرباں کرتی رعایا ہے نثار اُس پہ جاں
شرق سے تا غرب کراں تا کراں ملک اِس آہنگ میں ہے نغمہ خواں

قیصرۃ الہند سلامت رہے

فتنہ تو اس دَور سے بس دُور ہے صلح سے اور امن سے معمور ہے

عافیت اس وقت کا دستور ہے　　اس لئے افواہ میں مذکور ہے

قیصرۃ الہند سلامت رہے

شرق میں ہے فوج مظفر پڑی　　غرب میں ہے سدّ سکندر کھڑی
نظم و سیاست میں نہیں گلجھڑی　　سلطنتِ ہند نہ کیوں ہو بڑی

قیصرۃ الہند سلامت رہے

پرچم اقبال ہے اس کا بلند　　دولت و حشمت کارواں ہے سمند
دھاک ہے تا چین و خطا و یارقند　　ہند کو ہو کس لئے خوفِ گزند

قیصرۃ الہند سلامت رہے

زور قلم یا دمِ صمصام ہے　　مدّ نظر منفعتِ عام ہے
نیکیوں کا نیک سرانجام ہے　　سب کی دعا صبح سے تا شام ہے

قیصرۃ الہند سلامت رہے

نظم بے قافیہ

(۱) چڑیا کے بچّے

دو تین چھوٹے بچّے چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینہ سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونو بازو

اپنے پروں کے اندر بچّوں کو ڈھک لیا ہے
اِس طرح روز مرّہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم اُن کو
لیکن چڑا گیا ہے چُگّا تلاش کرنے
دانہ کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کر
جب لائے گا۔ تو بچّے مُنہ کھول دیں گے جھٹ پٹ
اُن کو بھرائے گا وہ۔ ماں اور باپ دونوں
بچّوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر
اور چھوٹے بچّے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے
اے چھوٹے چھوٹے بچّو۔ تم اونچے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گروگے۔ پَر اور پُرزے اب تک
نکلے نہیں تمھارے اِس واسطے ابھی تم
اونچے نہ اُڑ سکوگے۔ ہاں جب تمھارے بازو
اور پَر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں
سیکھوگے تم بھی اُڑنا۔ کرتے پھروگے چیں چیں
اڑتے پھروگے پھر پھر اے چھوٹے بچّو لیکن
کوّا بری بلا ہے اُس سے خدا بچائے

(۲) تاروں بھری رات

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اِس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

جو ہیں آفتاب تاباں
نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم
یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں
بڑی نعمت اور رحمت
اگر اتنی روشنی بھی
نہ میسّر آتی اُن کو
تو غریب جنگلوں میں
یونہیں بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی
نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشان راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے
وہ اُمّید وار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی
کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن
نہیں آنکھ اُن کی جھپکی

یونہیں شام سے سحر تک ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو ہو تمھیں اُنھیں سجھاتے
کہ گئی ہے رات اتنی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحرِ اعظم
اُنھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آ رہا ہے واپس
اُنھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے اُن کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تمھیں اُن کے رہنما ہو

مسدّس

(۱) ماں کی مامتا

مامتا ماں کی جانتے ہیں سب ماں ہے بچّے کی پرورش کا سبب
بھوک بچّے کو ہے ستاتی جب ماں سے کرتا ہے رو کے دودھ طلب

دودھ دیتی ہے پیار کرتی ہے
جان اُس پر نثار کرتی ہے
بچّہ سینہ سے جو رہا ہے چمٹ
نہیں لے سکتی بے دھڑک کروٹ
پانو کی بھی نہ ہو ذرا آہٹ
کبھی ننّھے کی نیند جائے اُچٹ
اُوں اُوں کرتی تھپکتی جاتی ہے
ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے
جب رہا وہ ننھا بچہ پڑ سو
چھوٹے تکیے لگا دئے دو دو
کئے سب کام تھے ضروری جو
پر نہیں بھولتی ہے بچّے کو
لیتی رہتی ہے ماں خبر ہر دم
اپنے بچّے پہ ہے نظر ہر دم
ماں کو آرام کی کہاں فرصت
سوئی بے ڈھب تو آگئی شامت
کپڑے لتّوں کی ہوگئی کیا گت
ہے بچھونا بھی تر بتر لت پت
صبح اُٹھ کر کھنگالتی ہے تمام
جاڑے پالے کا وقت اور یہ کام
بچّہ اتنے میں چونک اُٹھا سوکے
ناک میں دم کیا ہے رو رو کے
ماں نے پھر لے لیا ہے خوش ہوکے
نیا کُرتہ بدل کے مُنہ دھوکے
باتیں کرتی ہے پیار سے جوں جوں

بولتا ہے جواب میں آغوں

رات کو لوریاں سُناتی ہے
گود میں لے کے بیٹھ جاتی ہے
کس قدر زحمتیں اُٹھاتی ہے
بچّہ ہے اور ماں کی چھاتی ہے

کبھی کُنڈی بجا کے بہلایا
کبھی کندھے لگا کے ٹہلایا

ماں کوداتی اُچھالتی ہے اُسے
دیکھتی اور بھالتی ہے اُسے
ہر طرح پر سنبھالتی ہے اُسے
اللہ آمین سے پالتی ہے اُسے

دیکھ کر اُس کا چاند سا مکھڑا
بھول جاتی ہے اپنا سب دُکھڑا

جب لگایا ہے آنکھ میں کاجل
پڑا بچّہ کی تیوری میں بل
دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈالیں مل
بچّہ بے چین ہے تو ماں بے کل

چُپ کیا جُھنجُھنا بجا کے اُسے
سوئی خود پیشتر سُلا کے اُسے

ماں پکائے تو کھانا پکتا ہے
اور بچّہ ادھر بلکتا ہے
کبھی پرچھائیں ماں کی تکتا ہے
کبھی روتا کبھی ٹھُنکتا ہے

کھانا پکتا ہے نام ہی کو بس
لگتے ہاتھوں لیا ہے بھون جُھلس

اُس کا ہنسنا جدا لبھاتی ہے
اُنگلیوں سے اُسے چٹاتی ہے
باتیں کرنا اُسے بتاتی ہے
پاؤں چلنا اُسے سکھاتی ہے

ماں کو بچّہ سے جو محبّت ہے
درحقیقت خدا کی رحمت ہے

اتفاقاً جو ہو گیا بیمار
پھوڑا پھُنسی ہے یا زکام بخار
پھر تو ہر وقت ہے گلے کا ہار
ماں کو اُس سے زیادہ ہے آزار

اپنے آپے کا کچھ نہیں ہے ہوش
بیٹھی ہے بُت بنی ہوئی خاموش

وہم سے دل ہے کانپتا تھر تھر
اُڑ رہی ہیں ہوائیاں منہ پر
ہے فقط فضل پر خدا کے نظر
مانگتی ہے دعائیں رو رو کر

پڑ گئی کان میں کچھ اور بھنک
لگی ہونے کلیجہ میں دھک دھک

دشمنوں کا نہیں ہے جی اچھّا
ماں کو اک ہول ہو گئی پیدا
پھر تو دنیا جہان کی ہے دوا
ٹوٹکہ چھلّے کا منہ ذرا نہ کیا

ہوت اَن ہوت کا نہیں کچھ غم
رہے بچّہ کی خیریت جم جم

چاؤ اور چونچلوں سے پلتا ہے
آخرش پاؤں پاؤں چلتا ہے

گھر سے باہر بھی جا نکلتا ہے کھیلتا کودتا۔ اُچھلتا ہے
جب کہیں چوٹ چپینٹ ہے کھاتا
ماں ہی ماں کہہ کے ہے وہ چلّاتا
چیخ کو سُن کے دوڑی بیچاری آنسو ٹپ ٹپ ہیں آنکھ سے جاری
ہوئی بچہ پہ صدقے اور واری کون کرتا ہے یوں خبرداری
جھٹ کلیجے لگا لیا ماں نے
جھاڑا۔ پونچھا اُٹھا لیا ماں نے
اب تو اک اور ہو گیا کھٹکا جا کے اونچی منڈیر پر لٹکا
ماں نے بہتیرا اپنا سر پٹکا گر پڑا تو نہ کھائے گا جھٹکا
پھر دبے پانو جا کے لائی اُتار
دیا آہستہ ایک طمانچہ مار
خیر سے اب تو کام کرتا ہے روز مکتب میں شام کرتا ہے
کیا ادب سے کلام کرتا ہے سب کو جھک کر سلام کرتا ہے
ماں چٹاچٹ بلائیں لیتی ہے
پیار کرتی دعائیں دیتی ہے

(۲) مرثیہ سید اقبال احمد مرحوم[۱]

شب کو تھی تپ کے سبب سے مجھے آشفتہ سری جب سحر ہونے کو آئی تو ہوئی بے خبری

[۱] سعید اقبال احمد ہمشیرہ زادہ مصنّف نے یکایک بعمر ۲۲ سال ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا۔ مصنف کو اس عزیز سے خاص الفت تھی۔ اس مرثیہ کا مسودہ بھی گم ہو گیا یہ چند بند جو یاد تھے یہاں لکھے گئے ۱۲

ناگہاں آئی صدا کان میں وحشت کی بھری		برقِ جاں سوز تھی وہ تار کی پیغام بری

ہائے اقبال ترے نام کے تھے ساتھ لکھے
ایسے الفاظ کہ کٹ جائے اگر ہاتھ لکھے

آنکھ اے کاش نہ آتے تجھے وہ حرف نظر		کان بہرا نہ ہوا کیوں کہ نہ سنتا یہ خبر
عقل کھوئی نہ گئی کیوں کہ نہ کرتی باور		دل ہی اے کاش نہ ہوتا تو نہ ہوتا مضطر

ہائے اقبال! سنا گو کہ ترے مرنے کو
جی نہیں چاہتا زنہار یقیں کرنے کو

تیرے بچّوں کو نہیں حادثۂ غم کی خبر		گو کہ سیلابِ بلا سر سے گیا اُن کے گزر
جب بڑے ہوں گے کُڑھائے گی انھیں یاد پدر		تو ہی بتلا کہ تسلی انھیں ہوگی کیونکر

اس مصیبت کی نہیں ہے انھیں پہچان ابھی
پوچھتا پھرتا ہے سب سے تجھے احسان ابھی

تیری کشتی میں کئی ایک مسافر تھے غریب		حیف! پہنچا نہ گیا اُن کو تو ساحل کے قریب
کشتی ٹوٹی ہوئی اور جوش پہ طوفانِ مہیب		ڈھونڈتے ہیں تجھے گھبرا کے وہ برگشتہ نصیب

آہ منجدھار میں چھوڑا ہے سفینہ تو نے
کئی بدبختوں کا کٹوایا ہے سینہ تو نے

(یہ دو شعر دستیاب نہیں ہوئے)

جو ابھی حلقۂ ماتم کو سمجھتے ہیں برات
اُن کے چہرے پہ جمی گردِ یتیمی ہیہات
سینہ کہتا ہے کہ شعلے مجھے بھڑکانے دو — آہ کہتی ہے کہ مجھ کو بھی نکل جانے دو
آنکھیں کہتی ہیں کہ آنسو ہمیں برسانے دو — دل کی خواہش ہے کہ چپ چاپ ہی غم کھانے دو
صبر کہتا ہے کہ لو میں تو چلا ہاتھوں سے
منہ کو آتا ہے کلیجہ مرا ان باتوں سے

(۳) مرثیہ پلیونا [۵۱]

تھی صبح شبِ تار کی مانند کہر سے — آتی تھی نظر فوج اِدھر سے نہ اُدھر سے
جو چیز کہ تھی سامنے غائب تھی نظر سے — دشوار تھا اس وقت گزر راہ گزر سے
ناگاہ قدم روس کے لشکر نے بڑھایا
جنگاہ میں لشکر کو ہر افسر نے بڑھایا
اس معرکۂ سخت میں تھا زار بھی موجود — اور لشکرِ روسی کا سپہدار بھی موجود
رومانیہ کا والیِ غدّار بھی موجود — جنرل تھے بڑے نامی و جرار بھی موجود
رومانیہ اور روس کے لشکر ہوئے باہم
دو بحر تھے اک کوہ کی جنبش پہ فراہم
رشیا نے کیے جمع سوا لاکھ سپاہی — تھی شاق زبس حملۂ اوّل کی تباہی

۵۱ اس مرثیہ کے بہت سے بند تھے جو اتفاق سے گم ہو گئے یہ چند متفرق بند اُن لوگوں سے دستیاب ہوئے جن کو یاد تھے۔

نقصانِ گزشتہ کی مکافات جو چاہی　　دکھلائی بڑی دھوم سے اب شوکتِ شاہی

باقی نہ رہی جائے بجز خیمہ و خرگاہ

صحرائے پلونہ میں ہوئی بند گزرگاہ

میداں میں ہوئی تین طرف فوج مقرر　　جنگ آور و جرار مقرر ہوئے افسر

تھا سلسلہ توپوں کا ہر اک سمت برابر　　یوں وادی و کہسار میں پھیلے تھے ستمگر

پلٹن پہ تھی پلٹن تو رسالہ پہ رسالہ

روسی تھے پلونہ پہ کہ مہتاب پہ ہالہ

اُس وقت دیا دمدمۂ ترک نے پیغام　　ہے مستعدِ جنگ صفِ لشکرِ اسلام

او روس خبردار بس آگے نہ بڑھے گام　　یہ توپ کا گولہ ہے تمہارے لئے انعام

عثمانِ دلاور کے وہی شیر کھڑے ہیں

پہچانتے ہو حملۂ اوّل میں لڑے ہیں

جب زار نے عثمان پہ کی تاخت دوبارہ　　جو زور تھا لشکر کا وہ ڈالا میں سارا

اور آن کے میداں میں ہوا خود بھی صف آرا　　لیکن نہ دیا قسمت وارُوں نے سہارا

ہر حملہ میں اوندھا ہی پڑا زار کا لشکر

قسمت نہ لڑی گرچہ لڑا زار کا لشکر

برّاقی سنگین سے تھی آنکھ جھپکتی　　شمشیر بھی تھی صاعقہ کردار لپکتی

اور گولی پہ گولی متواتر تھی ٹپکتی　　میداں میں قضا پھرتی تھی کشتوں کو تھپکتی

بندوق شرربار سے جلتا تھا بیاباں
توپوں کے گرجنے سے دہلتا تھا بیاباں
لشکر کی چڑھائی تھی کہ دریا کی چڑھائی   تھی کوہ و بیاباں پہ گھٹا سی اُمنڈ آئی
دھوں دھاں کے سوا کچھ بھی نہ دیتا تھا سنائی   فوجوں کے سوا کچھ بھی نہ دیتا تھا دکھائی
ہتیار ہر اِک سمت چمکتے تھے جھما جھم
اور حادثۂ جنگ تھا تیزی پہ دمادم

(۴) متفرقات

ضعیفوں پہ زور آزمایا تو کیا   ستائے ہوؤں کو ستایا تو کیا
کسی دل جلے کو جلایا تو کیا   فساد اور فتنہ اُٹھایا تو کیا
نہ پکڑا کبھی دل کے اندر کا چور
نہ توڑا کبھی نفسِ سرکش کا زور

—·(·✣·)·—

مثمن

(۱)

مشعر کیفیتِ قلعہ اکبر آباد موسوم بہ آثار سلف

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے | یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے | یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے | بانیٔ عمارت کا جلال اِس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیِ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیِ اکبر

باہر سے نظر ڈالیے اِس قلعہ پہ یک چند | برپا ہے لبِ آبِ جمن صورتِ الوند
گویا کہ ہے اک سورما مضبوط تنومند | یا ہند کا رجپوت ہے یا تُرکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزاگند | رینی کا قزاگند پہ باندھا ہے کمربند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لیے برج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں | پُرشوکت و ذی شان ہے اِس کا رخِ بیروں
کی ہے شُعرا نے صفتِ طاقِ فریدوں | معلوم نہیں اِس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
گو ہم سرِ کیواں ہے نہ ہم پلۂ گردوں | محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں
پیلانِ گراں سلسلہ با ہودجِ زرّیں

اِس در سے گزرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا
یا طنطنۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا

یا شاہِ جہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا
یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا

القصّہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا
دُنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر

تھے جشنِ ملوکانہ اسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّٰی کہ جہاں عام تھا دربار
آئینہ نمط صاف ہیں جس کے درو دیوار

اور سقفِ زر اندود ہے مانندِ چمن زار
اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار

اب بانگِ نقیب اُس میں نہ چاؤش کی للکار
سرہنگِ کمربستہ نہ وہ مجمعِ حضّار

کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی

ہاں! قبلہ گہہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا وقر تھا منظور
نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور

شاہانِ معاصر کا معیّن تھا یہ دستور
کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور

تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُرنور
آوازہ میری شان کا پہونچا تھا بہت دور

اکنافِ جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری

تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں
وہ شاہ وہ نوئین۔ وہ خاقان کہاں ہیں

وہ بخشی و دستورِ وہ دیوان کہاں ہیں
خدّام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت
سیّاح کیا کرتے ہیں اب اُس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا

اورنگ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام
بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام
اشعار میں ثبت اُس پہ جہاں گیر کا ہے نام
شاعر کا قلم اُس کی بقا لکھتا ہے مادام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام
سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام

فرسودگیٔ دہر نے شق اب تو کیا ہے
آیندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں! اے لئے خاموش ہے او تخت جگر ریش
کس غم میں سیہ پوش ہے؟ کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش
جوگی ہے ترا پنتھ۔ کہ صوفی ہے ترا کیش
بولا کہ زمانہ نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

وہ رنگ محل بُرج مثمن کا وہ انداز
صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز
یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز
گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے بتلائے جو کیفیتِ آغاز
زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ بُرج منوّر
اب اُن کا مقابر میں تہِ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب
فوّارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جام بلوریں ہیں نہ وہ گوہر نایاب
وہ چلمنِ زرتار نہ وہ بستر کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب
یہ معرضِ خُدّام تھا وہ موقفِ حجّاب

وہ بزم نہ وہ دور نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق و رواق۔ اور در و بام ہیں باقی

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گل
سو وہ وہ تُرک اور مغل ہی سے نہ تھے کُل
کچھ خیری فرغانہ تھے۔ کچھ لالۂ کابل
پھر مولسری ہند کی اُن میں گئی مل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامّل
تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمّل

سیّاح جہاں دیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالات مرکب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
ہوتی تھی تلادان میں کیا کیا دہش و داد
وہ عدل کی زنجیر ہوئی تھی یہیں ایجاد
جو سمع شہنشاہ میں پہونچاتی تھی فریاد
وہ نور جہاں اور جہاں گیر کی اُفتاد
اس کلخ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّام زنانہ
وہ نہر۔ وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
ہے طرز عمارت سے عیاں شان شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ؟
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھپوری رہتی تھی بائی
تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
دیکھا اُسے جا کر تو بری گت نظر آئی
صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دہائی
ممکن نہیں طوفان حوادث سے رہائی

جس گھر میں تھے نسریں و سمن یا گل و لالہ
اب نسل ابابیل میں ہے اُس کا قبالہ

وہ مسجد زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن
خوبی میں یگانہ ہے و لے سادہ و پُرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن
موتی سے ہیں دالان تو ہے دودِ ستا نگن

کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن
یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے
سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تار نظر سے کہیں پتھّر کو سیا ہے
مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
گو شمع نہ فانوس نہ بتّی نہ دیا ہے
ہاں! چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارہ کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتّھر کی زبانی
اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی
کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
ان حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی
فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح نہ تہلیل نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا
مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا
ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عزّ و علا کا
جو کچھ تھا۔ گذر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی میرے باقی یہی دو تین

یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایہ مسکیں

وہ دَور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی
جو واقعہ حسّی تھا سو ہے آج خیالی

ہر کوشک و ایوان ہر اک منزل عالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی

آقا نہ خداوند - اہالی نہ موالی
جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی

یہ جملہ محلات جو سنسان پڑے ہیں

پتھّر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مغلیّہ کی تلوار
اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوان طلاکار

تب لیک جو تھا لشکر انگلش کا سپہدار
افواج مخالف سے ہوا برسرِ پیکار

یہ بارۂ و برج اور یہ ایوان یہ دیوار
کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار

ہے گردشِ ایّام کے حملوں کی کسے تاب

پھر قلعۂ اکبر ہی میں تھا کیا پرِ سرخاب

آخر کو لٹیروں کی شکستہ ہوئی قوّت
اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت

لہرانے لگا پھر عَلَمِ امن و حفاظت
آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمّت

یہ بات نہ ہوتی تو پہونچتی وہی نوبت
دیوار گری آج - تو کل بیٹھ گئی چھت

حُکّامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی

رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشم بصیرت سے کریں غور
اکبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور

سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور — ہر چند گزر جائیں بہت قرن بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برج حمل و ثور — اُس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور

انجینیروں کی بھی مرمّت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے؟ فقط ناموری ہے

او اکبرِ ذیجاہ! تیری عزّت و تمکیں — محتاج مرمّت ہے نہ مستلزم تزئیں
کندہ ہیں دلوں میں تری الفت کی فرامیں — ہے تیری محبّت کی بنا اک ذرِ روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں — زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پُشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تیری صحبت نے بھلایا — اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمت نے بھلایا — کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا — پچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا

آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تربت پہ چڑھا جاتے ہیں وہ پھول

ہو کہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم — شہرت ہے ترے نام کی سو قلعوں سے محکم
بھرتا ہے ہر اک فرقۂ محبّت کا تری دم — لکھتے ہیں مورّخ بھی تجھے اکبرِ اعظم
رُتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلّم — یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم

گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزّت ترا ہر سینہ میں تحریر

ہاں! قوم کے نو عمر جوانو اِدھر آؤ — ہے دیدۂ بینا تو اُسے کام میں لاؤ
آثارِ صنادید کی عینک کو لگاؤ — عبرت کی نگاہوں کو پس و پیش پھراؤ
راہِ طلبِ شوق میں اک شمع جلاؤ — گنجینۂ اعزاز کو پانا ہے تو پاؤ

یہ نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
دیکھو تمھیں دکھلاتے ہیں آیندہ کا رستہ

اسلاف نے ملکوں پہ اگر کی تھی چڑھائی — یا کاخِ حکومت کی تھی بنیاد اُٹھائی
یا طے کیے کوہ شکن سیمین و طلائی — یا بحر میں کشتیِ تجارت تھی چلائی
یا کشورِ تہذیب میں کی قلعہ کشائی — کس برتے پہ یہ کام تھے آخر مرے بھائی

جب بحرِ مصائب کو شنا کر کے ہوئے پار
تب دہرِ مخالف بھی ہوا غاشیہ بردار

عزّت کی ملی تھی اُنھیں جاگیر دوامی — دولت کے طرفدار تھے اور دین کے حامی
خصلت میں خوشامد تھی نہ عادت میں غلامی — رسموں میں خرابی تھی نہ اطوار میں خامی
گر فہم و فراست کی مجالس میں تھے نامی — تدبیرِ ممالک میں تھے وہ صدرِ گرامی

گر فتح و ظفر میں تھے سکندر سے زیادہ
تھے دانش و حکمت میں ارسطو کے بھی دادہ

کیا کیا طلبِ علم میں کرتے تھے جگر خوں
لیلیٰ تھا اگر علم تو وہ لوگ تھے مجنوں

کچھ بوعلی سینا ہی نہ تھا رشکِ فلاطوں
بہتوں نے کِیا یوں ہیں تحقیق کا گلگوں

مدّت کی کہانی ہے اگر سیرتِ ماموں
تاریخ میں دیکھو سببِ مرگِ ہمایوں

اکبر بھی تھا آخر اسی تہ جرعہ کا مخمور
تھا فیضی علاّمہ اسی کام پہ مامور

یہ کہنہ عمارات کہ ہیں وقفِ تباہی
اسلاف کے اوصاف پہ دیتی ہیں گواہی

صرف اصل و نسب ہی پہ نہ تھی اپنی مباہی
مکتب میں تھے اُستادِ ریاضی و الٰہی

میدانِ مساعی میں تھے اک مردِ سپاہی
زیبا تھا انھیں چترِ جہاں بانی و شاہی

کنیا نے تھے محنت سے نہ آلام سے تھکتے
کوشش کی گھٹا میں تھے وہ بجلی سے کڑکتے

وہ عیش کے مملوک تھے نے بندۂ راحت
گلگشتِ چمن زار تھی گویا انھیں عزّت

برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت
اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت

دنیا کے کسی کام میں ہیٹی نہ تھی ہمّت
بے غیرتی زنہار نہ تھی اُن کی جبلّت

ہمّت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزّت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

وہ صولت و سطوت میں تھے جوں شیرِ نیستاں
عزّت کے لئے جان کیا کرتے تھے قرباں

تھا انجمنِ عیش سے خوشتر انھیں میداں
محنت کے تھے بودے نہ مشقّت سے گریزاں

دشوار تھی بے حرمتی اور ننگ مگر ہاں آسان تھی نیزہ کی انی - تیر کا پیکاں

خیرات کے ٹکڑے پہ نہ گرتے تو تھے وہ حاشا

تھا نعل بہا اُن کو یہ دولت کا تماشا

وہ کعبۂ مقصود تھے یا قبلۂ حاجات کس منہ سے بزرگوں پہ کریں فخر و مباہات

سر اپنے گریباں میں ذرا ڈالیے ہیہات اوصافِ اضافی سے نہیں کچھ شرفِ ذات

تلوار میں جب کوئی اصالت کی نہ ہو بات گاہک تو نہ پوچھیگا - یہ کس کان کی ہے دھات

بندوق دمِ صید گر اچھی نہ چلی ہو

مردود ہے گو لندن و پیرس میں ڈھلی ہو

دل اپنی ستایش سے نہ بہلایئے حضرت اس راہ میں دھوکا نہ کہیں کھایئے حضرت

شیخی کو بہت کام نہ فرمایئے حضرت شعلہ کو تعلی کے نہ بھڑکایئے حضرت

آبا کی بزرگی پہ نہ اترایئے حضرت یہ گو ہے یہ میدان - اِدھر آیئے حضرت

اب بھی تو وہی خیر سے نسلِ شرفا ہے

آخر سبب اس نیک سرانجام کا کیا ہے

کیوں قوم کی حالت میں تنزل کا پڑا ڈھنگ کیوں انجمنِ عیش پرستی کا جما رنگ

کیوں تیغِ شرافت کو دنائت کا لگا زنگ مغلوبِ سفاہت ہوئے کیوں دانش و فرہنگ

روباہ بنے کس لیے شیرانِ صفِ جنگ کیوں بارگیِ عزم ہوا دونِ خرِ لنگ

کیوں ٹوٹ گئے بازِ عمل کے پر و بازو

کیوں ذرۂ عزت پہ لگا بولنے اُلّو

جڑ پہلے زمانہ میں جمی جیسے شجر کی — لذت ہمیں چکھنی ہے ضرور اُس کے ثمر کی
بے شک ہے یہ پاداش اُسی شور کے شر کی — ہاں مستحق اولاد ہے میراث پدر کی
تفتیش کرو دوستو! اخبار و سیر کی — فہرست مرتب کرو ہر عیب و ہنر کی

دو ڈیڑھ صدی پہلے سے جو اپنا ڈھچر تھا
انصاف سے دیکھو اُسے کیا پوچ و لچر تھا

جو راہ نمائی کو چلے آپ تھے گمراہ — حالات سے واقف نہ مقامات سے آگاہ
شیروں کی جگہ جمع ہوا گلّۂ روباہ — ہر کرمکِ شب تاب بنا مدّعیِ ماہ
ہر شخص کو تھی خود غرضی سے طلب جاہ — ویسے ہی امیر الامرا جیسے شہنشاہ

رسم حسد و بغض و عداوت ہوئی تازہ
آخر کو اُٹھا دولت و عزت کا جنازہ

وہ غور کے غزنیں کے دلیرانِ ظفر مند — وہ شاہ سوارانِ بخارا و سمرقند
جو ہند کے خطّے میں ہوئے خاک کے پیوند — جی اُٹھتے دوبارہ اگر اُن میں سے تنے چند
ہاں وہلۂ اوّل میں تو ہوتے ہی وہ خرسند — پھولے نہ سماتے کہ ہمارے ہیں یہ فرزند

پر دیکھتے جب اِن کے بُرے فعل بُرے قول
جا بیٹھتے قبروں ہی میں پڑھتے ہوئے لاحول

کیا حال تھا حضراتِ ملوک اور امرا کا — انبوہ تھا بیہودہ مشاغل کی بلا کا

یا فوج کنیزوں کی تھی اِک قہرِ خدا کا | یا بولتا طوطی تھا کسی خواجہ سرا کا
یا شور خوشامد کا تھا یا مدح و ثنا کا | تھا غول گویّوں کا۔ تو جمگھٹ شعرا کا

سِفلے تھے مشیر اور مصاحب تھے چھچھورے
وہ عقل کے دشمن تو حضور ان سے بھی کورے

کاسد ہوا بازار ہر اِک طرزِ عمل کا[له] | عالم نظر آتا ہے بتر آج سے کل کا
مفلس ہیں تو پیشہ ہے فریب اور دغل کا | اندیشہ نہیں کچھ انھیں ایمان کے خلل کا
مدّت سے گیا ڈھانچ بگڑ اہلِ دول کا | چکھا ہے مزہ خوب ہی اسراف کے پھل کا

اب کوئی اگر دولتِ قومی کی کرے جانچ
ٹٹ پونجیے البتہ نکل آئیں گے دس پانچ

اب نام کو ہم میں جو گروہِ شرفا ہے | سو حالتِ افلاس میں جینے سے خفا ہے
یا شامتِ اعمال سے پامالِ جفا ہے | کچھ حسنِ معیشت نہ کہیں صدق و صفا ہے
کچھ دولتِ دنیا ہے تو بے مہر و وفا ہے | کچھ دین کا چرچا ہے تو وہ روبہ قفا ہے

چھائے گی تنزّل کی ابھی ہم پہ گھٹا اور
ہم اور ہوا ہیں ہیں۔ زمانہ کی ہوا اور

جو لوگ یہ سمجھے کہ ہیں صرف اپنے لئے ہم | اغراض و مقاصد ہیں فقط اپنے مقدّم
یاروں کی انھیں فکر نہ غیروں کا انھیں غم | ہمدردِ عشیرت ہیں نہ ہمسایوں کے ہمدم
وہ فہم و فراست میں بہائم سے بھی ہیں کم | یا سنگ ہیں یا خشت ہیں جائیں بہ جہنّم

له پہلے ایڈیشن میں یہ پانچ بند غلطی سے شائع نہیں ہوئے ۱۲

اِن مردہ دلوں سے تو کرو قطع نظر بس
لے ڈوبیں گے تم کو بھی چلے اِن کا اگر بس

جو قوم کے اوصاف تھے سو اُن میں سے اکثر — آپس کی کشاکش میں گلا گھُٹ کے گئے مر
غمخواری و احسان و مروّت کا لُٹا گھر — انصاف کا اور دین و دیانت کا کٹا سر
نیکوں سے ہوئے بد۔ تو بدوں سے ہوئے بدتر — کاشانۂ دولت کی جگہ رہ گئے چھپّر

جو کام تھے یاروں کے سو گردن زدنی تھے
خود اپنے لئے مستعدِ بیخ کنی تھے

جرأت تھی سو آپس کی عداوت میں ہوئی صرف — قوّت تھی۔ سو رشک اور رقابت میں ہوئی صرف
شوکت تھی۔ سو خود بینی و نخوت میں ہوئی صرف — فرصت تھی سو بیکاری و غفلت میں ہوئی صرف
عزت تھی۔ سو افلاس و فلاکت میں ہوئی صرف — دولت تھی سو عیاشی و عشرت میں ہوئی صرف

اُس وقت ہمیں عاقبت الامر ہوا ہوش
جب رہ گئے ہم لوگ بیک بینی و دو گوش

مدت سے زمانہ میں ترقی کا پھُنکا صور — عالم میں بجا اور ہی تحقیق کا طنبور
آفاق میں پھیلا نئی ایجاد کا منشور — خورشید برآمد ہوا بھاگی شبِ دیجور
ہم دے کے ڈھئی کلبۂ احزاں میں بدستور — سوتے رہے غفلت میں پڑے بے خود و مخمور

ناوقت کھُلی آنکھ تو حیراں ہیں اب ہم
ہم کون ہیں کیا چیز ہیں اے وائے عجب ہم

ہم چاہتے ہیں عیش بھی اور ناموری بھی   دولت بھی ہمیں چاہیے اور بے ہنری بھی
اعزاز بھی مطلوب ہے بیہودہ سری بھی   آوارگی منظور ہے اور راہبری بھی
مقصود رفو بھی ہے مگر جامہ دری بھی   گر پستیِ ہمت ہے تو عالی نظری بھی
یہ بات تو ہوگی نہ ہوئی ہے کبھی آگے
پھرتے ہیں محالات کے پیچھے یونہیں بھاگے

خیراب کوئی تدبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے   کفارۂ تقصیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ چارۂ تاخیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے   اس حال کو تغیّر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
فریاد میں تاثیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے   اس خواب کی تعبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ بھی نہیں دشوار اگر ٹھان لو جی میں
گھنٹوں میں ہو وہ کام جو ہوتا ہو صدی میں

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے   بے غوطہ زنی گنج گہر کس کو ملا ہے
بے خون پیئے لقمۂ تر کس کو ملا ہے   بے جور کشی تاجِ ظفر کس کو ملا ہے
بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے   بے کاوشِ جاں علم و ہنر کس کو ملا ہے
جو رتبۂ والا کے سزاوار ہوئے ہیں
وہ پہلے مصیبت کے طلبگار ہوئے ہیں

کوشش ہی نے اجرام سماوی کو ہے تولا   کوشش ہی نے طبقات زمیں کو ہے ٹٹولا
کوشش ہی نے رستۂ ترقی [illegible] ہے کھولا   کوشش ہی نے گوہر ہے تہِ بحر سے رولا

کوشش ہی کا طوطی ہے سدا دہر میں بولا کوشش ہے غرض طرفہ طلسمات کا گولا
قدرت نے فتوحات کی رکھی ہے یہی راہ
سعی اپنی طرف سے ہو تو اتمام من اللہ

ہیں آج کل اسکول کے کمرے صفِ ہیجا سرمایۂ علم و ہنر و فضل ہے یغما
ہر قوم کا پُر مالِ غنیمت سے ہے کیسا لیکن تمھیں کچھ سود و زیاں کی نہیں پروا
کیوں قوم کے اعزاز کی لٹیا کو ڈبویا کیوں کسبِ کمالات میں تم ہو گئے پس پا
اوروں سے تو بودے نہ تھے مانا کہ تم ایسے
میدان سے کیوں بھاگ گئے نوک دم ایسے

ہر چند کہ دعوی تھا تمھیں سیف و قلم کا تھا فخر تمھیں نسلِ عرب اور عجم کا
لیکن نہ رہا طرز وہ عادات و شیم کا سیکھا نہ وتیرہ کوئی اربابِ ہمم کا
ناچار ہر اک قوم نے تم کو لیا دھمکا بے سعی کسی کا بھی ستارہ نہیں چمکا
تم راہِ طلب میں ہو اگر اب بھی شتاباں
ہو کوکبِ عزت افقِ دہر پہ تاباں

اب تک بھی سکت ہے وہی ہڈی میں تمھاری اب تک بھی وہی خوں ہے شرائین میں جاری
افغانی و ترکی و حجازی و تتاری ایرانی و تورانی و بلخی و بخاری
اے دوستو! ہمت ہی مگر تم نے تو ہاری اس واسطے بس کرکری شیخی ہوئی ساری
مدِ علما دفترِ قومی میں ہے خالی

فارابی و طوسی ہیں نہ رازی و غزالی

تلواروں کا سایہ تھا جنھیں سایۂ طوبیٰ
جولاں گہہ ہمت تھی جنھیں وسعتِ دنیا

تھا ریگِ رواں جن کے لئے بسترِ دیبا
اور خیمۂ اطلس تھا یہی قبۂ خضرا

ہے تم کو اگر اُن کے خلف ہونے کا دعوےٰ
دکھلاؤ حریفوں کے مقابل ہنر اپنا

ترتیب سے جم جاؤ قرینہ بقرینہ

میدانِ ترقی میں لڑو سینہ بہ سینہ

یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی
اس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی

یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی
یہ جنگ ہے تحصیل عمل اور نظر کی

اس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی
آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی

یہ جنگ نہیں وضعِ مروّت کے منافی

اس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

ہے جنگ سے مقصود بلندیِ ارادہ
وہ ہم سے زیادہ ہوں تو ہم اُن سے زیادہ

رستہ ہو تعصّب کا نہ کینہ کا ہو جادہ
نقشِ حسد و بغض سے افعال ہوں سادہ

دل صاف رہے اور طبیعت بھی کشادہ
اس طور سے حاصل کرو عزت کا وسادہ

گر جوہرِ ہمت ہے تو سبقت میں کرو کد

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

باقی ہے اگر جوشِ حمیت کا حرارہ
تو معرکۂ علم میں ہو جاؤ صف آرا

جاں ڈال دو ناموس کے قالب میں دوبارا — پیچھے نہ ہٹاؤ قدمِ عزم خدارا
ذلّت نہیں ہوتی کبھی مردوں کو گوارا — چمکو فلکِ جاہ پہ تم بن کے ستارا
آبا نے کیا فتح جو بنگال و دکن کو
تسخیر کرو تم عمل و علم کو فن کو

ادنیٰ سا بھی ہر کام ہے اب علم کا محکوم — بے علم ہے جو قوم سو حال اُس کا ہے معلوم
دولت سے ہے بیگانہ تو عزّت سے ہے محروم — اقوال کمینہ ہیں تو افعال ہیں مذموم
اربابِ ہنر کی کرۂ ارض پہ ہے دھوم — سب حلقہ بگوش اُن کے ہیں وہ سب کے ہیں مخدوم
دنیا میں اُسی قوم کا گلزار ہے پھولا
جو رکھتی ہے دانش میں ہنر میں یدِطولا

تم جانتے ہو خوب کہ انسان ہے فانی — فانی ہے بلا شبہ مگر اُس کی نشانی
کیا اُس کی نشانی ہے سنو میری زبانی — امثال میں مذکور ہے پچھلوں کی کہانی
خوش بخت تھے وہ۔ کر گئے جو فیض رسانی — بدبخت تھے مغلوبِ صفاتِ حیوانی
گر تم بھی یونہیں اُٹھ گئے حیوان سے رہ کر
آیندہ کی نسلیں تمھیں کیا روئیں گی کہہ کر

پھل خدمتِ قومی ہے اگر نخل ہیں اقوال — تن خدمتِ قومی ہے اگر جامہ ہیں افعال
جان خدمتِ قومی ہے اگر جسم ہیں اعمال — ملحوظ رکھو خدمتِ قومی کو بہرحال
پُرنفع یہی شغل ہے مِن جملۂ اشغال — جو زندۂ جاوید ہیں اُن کی ہے یہی چال

پُر الفتِ قومی سے ہے جن کا رگ و ریشہ
مرنے کو تو مرتے ہیں۔ پہ جیتے ہیں ہمیشہ

قوّت ہے اگر دل میں دماغوں میں ہے طاقت
پہنچاؤ بہم حسنِ بیاں اور طلاقت
اِصلاحِ معائب میں کرو صرف لیاقت
دکھلاؤ مریضوں کے مداوا میں حذاقت
رکھو نہ غریبوں پہ روا طعنِ حماقت
قومی ضُعفا کی نہ کرو ترک رفاقت
کیا دولتِ ہستی ہے پئے نفس پرستی
آباد کرو قوم کی اُجڑی ہوئی بستی

ہے قوم اگر باغ تو تم اُس کے شجر ہو
ہے قوم اگر نخل تو تم اُس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو تم نورِ بصر ہو
ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو
نظارگی ہے قوم۔ تو تم مدِّ نظر ہو
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلّت سے بچاؤ
گوسالۂ غفلت کی پرستش کو چھڑاؤ

او باغِ خزاں دیدہ کے نوخیز نہالو
او ساحتِ ہستی کے نئے دوڑنے والو
مضبوط کرو دل کو طبیعت کو سنبھالو
کچھ دُور نہیں۔ منزلِ مقصود کو جالو
ہاں! مدِّ مقابل بنو ہتھیار نہ ڈالو
میدانِ ترقی کی زمیں سر پہ اٹھالو
زنہار گوارا نہ کرو ننگِ ہزیمت
موقع ہے ابھی گرم کرو رخشِ عزیمت

غیرت ہو تو گر گر کبھی سنبھلنا نہیں مشکل　　جرأت ہو تو نرغہ سے نکلنا نہیں مشکل
ہو صبر تو آفات کا ٹلنا نہیں مشکل　　ہو آنچ تو پتھر کا پگھلنا نہیں مشکل
ہمت ہو تو حالت کا بدلنا نہیں مشکل　　انجن ہو تو گاڑی کا بھی چلنا نہیں مشکل

گرمی سے کرو پہلے بخارات مہیّا
پیدا حرکت ہو تو لگے گھومنے پہیّا

ہمّت ہی حرارت ہے وہی ہے حرکت بھی　　ہمّت ہی سے ہر قوم نے پائی ہے ترقّی
گر چیونٹی تیمور کی ہمّت نہ بندھاتی　　ہتھیار بھی بے کار تھے اور فوج نکمّی
ہمّت ہے سرانجامِ مہمّات کی کنجی　　ہمّت ہی حقیقت میں ہے توفیقِ الٰہی

ہمّت ہی بنا دیتی ہے مفلس کو تونگر
ہمّت کے سفینہ کا اٹھا دیجیے لنگر

ہمّت ہے اگر تم میں تو میدان لیا مار　　ڈٹ جاؤ کمر باندھ کے ہشیار! خبردار!
اوروں ہی کے گنڈے پہ نہ رہنا کبھی نہار　　ہونے نہ دو اعزاز کے جھنڈے کو نگونسار
لو ہاتھ میں اب تم بھی کوئی ہمت کی تلوار　　اس معرکۂ سخت میں مردانہ کرو وار

ہاں قوّتِ بازو سے بلا شرکتِ غیرے
آگے کو بڑھو کھول دو نصرت کے پھریرے

قسمت کی برائی ہے نہ تقدیر کا ہے پھیر　　خود اپنے ہی کرتوت سے برپا ہے یہ اندھیر
تحصیلِ فضائل میں جوانو! نہ کرو دیر　　فرصت کو اگر اور مگر میں نہ کرو تیر

بزدل نہ بنو حق نے بنایا ہے تمھیں شیر • کہسار بھی ہو تو اسے کر دو زبر و زیر

یلغار کرو علم کے میداں میں عزیزو

آخر تو ہو تم قومِ مسلماں میں عزیزو

جس[1] بستی میں دیکھو کہ نحوست ہے برستی • غالب ہے کہ ہو گی وہ اسی قوم کی بستی

گرتی چلی جاتی ہے ابھی جانبِ پستی • چلتی ہے فضولی کی سند تیغ دو دستی

لے دے کے یہی جنس ہے اس دور میں سستی • فاقہ پہ ہے فاقہ مگر اب تک وہی مستی

مل بیٹھ کے اندیشۂ انجام نہ کرنا

روٹی ملے جس کام سے وہ کام نہ کرنا

خیلِ علما کی بھی حمیت ہوئی زائل • تبدیل رذائل سے ہوئے جملہ فضائل

مرتے ہیں مشیخت پہ تفاخر پہ ہیں مائل • چھپتے ہیں فریقین سے پرزہر رسائل

لاکھوں ہیں پڑے خنجرِ تکفیر کے گھائل • باعث ہیں جدل کے یہی فقہیہ مسائل

برپا ہے شب و روز یہاں چپقلش ایسی

عالم ہے لقب اور یہم کش مکش ایسی

---

[1] یہ دو بند بھی منجملہ ان پانچ بندوں کے ہیں جو اب تک آثارِ سلف کے کسی ایڈیشن میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ۱۲

انسان [1]

میں بھی کیا خوب ہوں مجھ پر نہ کھلا راز اپنا نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا
شاید اس بزم میں ہے مرتبہ ممتاز اپنا لیکن اوروں سے نرالا ہے کچھ انداز اپنا
ہوں تو بے قدر پہ مجموعۂ کل عالم ہوں
میں ہی مسجودِ ملائک ہوں اگر آدم ہوں

ابر و باد و مہ و خورشید مرے کام میں ہیں مرغ و ماہی و دد و دام مرے دام میں ہیں
آب و آتش مری خدمت کے سر انجام میں ہیں کُل جمادی و نباتی مرے خدّام میں ہیں
مجھ میں قدرت نے عجب فضل و شرف رکھا ہے
میں نے فردوس کے میووں کا مزہ چکّھا ہے



[1] صرف دو بند ایک مسودہ میں سے جو یہاں درج کئے گئے ۔ مرتبہ ۱۹۳۸ء

ترجیع بند

(۱) نالۂ چند در فراق شیخ

اے! شاہِ یگانۂ زمانہ   اے! بحرِ محیطِ بے کرانہ
کیوں اہلِ نیاز کے سروں سے   خالی ہے یہ سنگِ آستانہ
وہ محفلِ اُنس اب کدھر ہے   یارب ہے! کہاں وہ کارخانہ
وہ بزم نہ وہ جمالِ ساقی   وہ جام نہ وہ مئے مغانہ
وہ طور ہے اب نہ وہ تجلّی   وہ وقت ہے اب نہ وہ زمانہ
کیا ہوگیا؟ جلوۂ سحرگاہ   کیا ہوگئی؟ صحبتِ شبانہ
ہے دل میں ابھی وہی تصوّر   ہے یاد ہنوز وہ فسانہ
وہ فصل نہ وہ بہار باقی   وہ گل نہ چمن نہ آشیانہ
رہتی ہے اُچاٹ سی طبیعت   ملتا ہی نہیں کہیں ٹھکانہ
جان حسرتِ دید میں طپاں ہے   دل تیرِ فراق کا نشانہ
ساحل پہ پڑے ہیں سب مسافر   کشتی ہوئی کس طرف روانہ

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوث علی شہِ قلندر

اے! کعبۂ خاص وقبلۂ عام   تھی تیری گلی مقامِ احرام

تھا مامنِ جاں حریمِ اقدس | آغاز کا غم نہ خوفِ انجام
سب محو تھے ظلِّ عاطفت میں | خطرات و خیال و فکر و اوہام
اُس بحرِ محیط میں تھے سب گم | نیکی و بدی و کفر و اسلام
پُرشور تھے بے لب و دہاں ہم | سرمست بدونِ بادہ و جام
مشغولِ جمال بے سر و چشم | مصروفِ سفر بغیرِ اقدام
دریا ہوا اک عطا سے قطرہ | پختہ ہوا اِک نگاہ سے خام
کیخسرو و کیقباد سے بھی | تھے بخت بلند تیرے خدّام
دیکھا اب ہجر چار ناچار | دیکھی فرقت بھی کام ناکام
کہہ دیجیو اے نسیم! یہ بات | لے جائیو اے صبا! یہ پیغام

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوث علی شہِ قلندر

ہوتی ہے جہاں ہیں کم کوئی ذات | بے علت و نسبت و اضافات
خورشید تھا وہ وجودِ باجود | دریا تھی وہ ذاتِ فیض آیات
دیرینہ نہنگِ بحرِ توحید | مردانہ قلندرِ خرابات
سلطانِ جہانِ ترک و تجرید | شہبازِ معارفِ نہایات
نے میلِ مراتب و مدارج | نے رغبتِ کشف نے کرامات
ملتی تھی مراد طالبوں کو | اُس در سے بدونِ عرضِ حاجات

اُس بات کی ہوگئی گرہ وا
دل میں کبھی نہ تھی ہنوز جو بات

خلوت میں ترا جمال مفتاح
جلوت میں ترا کلام مشکوٰۃ

کیا تھی؟ وہ نظر سحابِ رحمت
کیا تھا؟ وہ زمانہ فصلِ برسات

وہ وقت نہ وہ زمانہ افسوس
وہ لطف نہ وہ بہار ہیہات

اک آن کی آن تھی حضوری
اک بات کی بات تھی ملاقات

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوث علی شہِ قلندر

اے! بحرِ حقیقتِ خدائی
اے! جلوۂ شانِ کبریائی

باقی نہیں کوئی مشغلہ اب
رندی ہی رہی نہ پارسائی

شاہی کا نہیں خیال سر میں
جی میں نہیں حسرتِ گدائی

نے بندِ قفس نہ شوقِ پرواز
باقی ہے نہ قید نے رہائی

نے حرص و ہوا نہ کچھ توکّل
نے برگ و نوا نہ بے نوائی

نے فکرِ قصیدہ ہائے عطّار
نے ذکرِ حدیقۂ سنائی

نے قُربِ نوافل و فرائض
نے تنگ دلی نہ دلکشائی

بندہ نہ خدا نہ دین و دنیا
کی آپ نے خوب ہی صفائی

لیکن نہ مٹا غبارِ فرقت
ہر چند کہ طاقت آزمائی

مشکل ہوا کاٹنا دنوں کا
دشوار ہوئی تری جدائی

دل سینہ میں ہے کہ برقِ بیتاب　　اندوہ کی اک گھٹا ہے چھائی

ہے جوش میں ہجر کا سمندر

یا غوث علی شہِ قلندر

ایّامِ وصال بھی تھے کیا دن　　راتیں تھیں مراد مدّعا دن

محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات　　معلوم نہ تھا کدھر گیا دن

کیا جلد گزر گئے وہ دن حیف　　ہوتا کوئی اور بھی سوا دن

تھی رات بہت دنوں سے اچھّی　　راتوں سے زیادہ خوب تھا دن

تھی بزمِ وصال دن ہویا رات　　تھی دیدِ جمال شب ہویا دن

دُنیا میں بزرگ تھی وہی رات　　تھا عمر میں بس وہی بڑا دن

ہر صبح عجیب شام نادر　　ہر رات جدید اور نیا دن

تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات　　تھی شب کو مسرّت اب ہوا دن

عالم کو زبس کہ ہے تغیّر　　رہتے نہیں ایک سے سدا دن

تھا خواب وخیال وہ زمانہ　　بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات یہی فغاں ہے لب پر　　وہ رات رہی نہ وہ رہا دن

ہے جوش میں ہجر کا سمندر

یا غوث علی شہِ قلندر

اے قبلۂ عالمِ معانی　　سلطانِ جہانِ بے نشانی

اے ابحر معارف و حقائق — شاہنشہ ملک جاودانی
آگاہ مقاصد برونی — دانائے خواطر نہانی
یک رنگ و یگانہ و یک آئیں — بے فرق مکانی و زمانی
خصلت میں عجیب دلنوازی — عادت میں کمال مہربانی
تھی آپ پہ ختم بذلہ سنجی — تھی آپ پہ ختم نکتہ دانی
باتوں میں طریق دلکشائی — لفظوں میں ادائے خوش بیانی
تھے گو ہر قدس وہ اشارات — اور غیب سے تھی وہ دُرفشانی
القصہ وہ احسن القصص تھی — جو بات سنی تری زبانی
آیا نہ پسند یاں کا رہنا — برباد ہو یہ سرائے فانی
جو کچھ گزرا سو تھا فسانہ — جو کچھ دیکھا سو تھی کہانی

ہے جوش میں بحر کا سمندر
یا غوث علی شہ قلندر

اے بحر کرم محیط نایاب — لب تشنہ ہیں ماہیان بے آب
اے نوح سفینۂ مسرت — طوفاں زدہ ہیں تمام اصحاب
پانی پت تھا بقا کا چشمہ — اب کیا ہے غم و الم کا گرداب
روتے ہیں یہاں کے سب درو بام — حوض و حجرہ ستون و محراب
آتے تھے مدام تیرے مہمان — بنگالہ سے لے کے تا بہ پنجاب

جلوہ تھا یہ تیرے دم قدم کا
اب کیا ہے کہ مجتمع ہوں احباب

وحشت زدہ پھرتا ہے غلامی
اور غم زدہ مضطرب ہے نوّاب

ملفوظ مبارک و گرامی
ہے زندگی حسن کا اسباب

ساحل ہے کہیں نہ تھل نہ بیڑا
سب بحرِ فراق میں ہیں غرقاب

افسوس ہوا نظر سے پنہاں
وہ شمسِ منوّرِ جہاں تاب

اے ملکِ بقا کے جانے والو
کہہ دیجیو بعد عرض آداب

ہے جوش میں ہجر کا سمندر
یا غوث علی شہِ قلندر

(۲) ہفت درودِ محمود

خلیل حق کی تھی جو اشارت
اور ابن مریم کی جو بشارت

ظہور احمد سے تھی عبارت
سمجھ گئے صاحب بصارت

کہ اب گری کفر کی عمارت
گھٹے گی فارس کی اب حرارت

مٹے گی روما کی اب شرارت
لٹے گی اب مصر کی امارت

خزانہ ہرقل کا ہوگا غارت
بڑھے گا تقوی بھی اور طہارت

ہے باغ اسلام کو نضارت
نیا ہے سلطان نئی وزارت

صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر
اور اُس کے سب آلِ باصفا پر

اور اُس کے اصحاب باوفا پر اور اُس کے احباب اتقیا پر

۲
وہ اوجِ پیغمبری کا تارا ہوا ہے مکّہ میں جلوہ آرا
کرے گا جو ماہ کو دو پارا ہے جس کا قوسین تک گزارا
وہ اُمّتوں کے لئے سہارا وہ جس نے اخلاق کو سنوارا
کرے جو صورت کوئی نظارا مہابت اُس پر ہو آشکارا
ہے زلزلہ میں جہان سارا محل کسرے و ملک دارا
نہیں اطاعت سے اُس کی چارا یہود ہو یا کوئی نصاریٰ
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر اور اُس کے سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر اور اُس کے احباب اتقیا پر

۳
وہ جلوۂ نورِ کبریائی وہ صاحبِ دعوتِ خدائی
وہ عینِ تقویٰ و پارسائی بنا ربت خانہ اُس نے ڈھائی
وہ قُربِ حق میں جسے رسائی بمجتبائی و مصطفائی
ہے دھوم توحید کی مچائی کہ خود بتوں نے بھی دی دہائی
عرب کو انسانیت سکھائی دلوں سے کینہ کی کی صفائی
ہر ایک بُرائی کی جڑ مٹائی مری ہوئی قوم پھر جلائی
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر اور اُس کے سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر اور اُس کے احباب اتقیا پر

۴ وہ علم و حکمت سکھانے والا   پیام حق کا وہ لانے والا
کلام حق کا سنانے والا   عذابِ حق سے ڈرانے والا
وہ رسمِ بد کا چھڑانے والا   وہ جہل و بدعت مٹانے والا
وہ بت پرستی اُٹھانے والا   وہ سیدھا رستہ چلانے والا
خدا پرستی بتانے والا   وہ عاصیوں کا بچانے والا
مقام محمود پانے والا   وہ بیت اقصیٰ کا جانے والا
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر   اور اُس کے سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر   اور اُس کے احباب اتقیا پر

۵ وہ جلوہ ہے نور کبریا کا   وہ صدر ہے بزم اصطفا کا
امام ہے خیل انبیا کا   ہے پیشوا مسلکِ ہدیٰ کا
معین انصاف اور وفا کا   مٹانے والا ہے وہ جفا کا
طبیب ہے شرک اور ریا کا   کہ خاص بندہ ہے وہ خدا کا
ہے آئینہ صدق اور صفا کا   وہ شاہ تسلیم اور رضا کا
وہ قبلہ ہرِ شاہ کا گدا کا   وہ کعبہ ابرار و اصفیا کا
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر   اور اُس کی سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر   اور اُس کے احباب اتقیا پر

۶ نبیِ اُمّی لقب ہے اُس کا   نسب میں خورشید ہاشمی تھا

نہ کچھ کسی سے پڑھا نہ لکھا | وہ ان پڑھوں میں ہوا تھا پیدا
نہ اُس کے سر پہ پدر کا سایا | نہ اُس کو اُستاد نے پڑھایا
کہ اُس پہ روح الامین آیا | کلام ربّی اُسے سکھایا
وہ بحرِ اعظم تھا علمِ حق کا | نہ تھا وہ محتاج علمِ اشیا
اُسے تھا مکشوف رمزِ اولیٰ | اُسے تھا معلوم سرِّ اُخریٰ
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر | اور اُس کی سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر | اور اُس کے احباب اتقیا پر

وہ فخرِ آدم امانِ عالم | امین محکم رسول اکرم
محیط اعظم زغیب ملہم | بوحی محرم شہ مسلّم
عرب کے اندر وہی معظم | عجم کے اندر وہی مکرّم
لگا کے آدم سے تابایں دم | ظہور اُس کا ہے بعد آدم
وجود اُس کا مگر مقدّم | وہ نورِ حق تھا و لے مجسّم
کیا مدینہ کو سبز و خرّم | درود محمود بھیج پیہم
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر | اور اُس کی سب آل باصفا پر
اور اُس کے اصحاب باوفا پر | اور اُس کے احباب اتقیا پر

قصائد

(۱) قصیدہ[1]

قید سخت اور خانہ بے در — نکلوں کیوں کر جہان سے باہر
تنگ تر ہیں حدودِ خطۂ خاک — نہیں دُنیا میں کوئی شکلِ گزر
سعی بے کار فکر لاحاصل — نہ دوا میں نہ کچھ دعا میں اثر
ناشکیبا دل و پریشاں دل — پاؤں کا ہوش ہے نہ سر کی خبر
ایسا حیراں کہ میں سمجھتا ہوں — آئنہ کو بھی سدِّ اسکندر
کبھی مثلِ سحاب ہوں گریاں — گاہ مانند برق ہوں مضطر
کیوں نہ شکوہ کروں نصیبوں کا — کیوں نہ افسوس آئے قسمت پر
میں ہوں شمشیرِ لیک زنگ آلود — کوئی مل جائے قدرداں اگر
اُس پہ کھُل جائیں کچھ مرے اوصاف — اُس پہ ظاہر ہوں کچھ مرے جوہر
آرزوئے زماں ہوں سرتاپا — حسرتِ روزگار ہوں یکسر
اپنے جوہر دکھائے کس کو — نہ رہی آہ قدرِ تیغ و سپر
یہ ہی الفاظ تھے زباں پر رات — کہ کہا مجھ سے عقل نے آکر
نہیں شایاں شکایتِ تقدیر — نامناسب ہے شکوۂ اختر
جتنے گذرے ہیں آگے عالی فہم — رکھتے تھے روئے خاک پر بستر

[1] یہ قصیدہ شیخ یعقوب علی مرحوم کی فرمایش سے ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا ۱۲

جتنے گذرے ہیں صاحبِ اوصاف — موردِ طعن خلق تھے اکثر
وہی ہوگا جو ہولیا پہلے — یعنی کیا چارۂ قضا و قدر
جس کو چاہے بنائے وہ گمنام — جس کو چاہے کرے وہ نام آور
رنج و محنت ہے گو زمانہ میں — ہے تجھے تو مقامِ شکر مگر
بختِ ناکام کا تجھے کیا خوف — گردشِ چرخ کا تجھے کیا ڈر
تو نہ دُنیا کے غم میں ہو پابند — تو زمانہ کا ہو نہ دست نگر
کہ ترا دست گیر ہے موجود — اور ترا سرپرست ہے سرپر
وہ سخاوت منش سخاوت کیش — وہ کرم پیشہ وہ کرم گستر
وہ شرف دوست وہ شریف نواز — وہ ہنر دوست وہ ہنر پرور
کوہ جس پر کرے تصدق لعل — بحر جس پر کرے نثار گہر
وہ زمانہ میں صاحبِ شمشیر — وہ رئیسوں میں قابلِ افسر
جس کو دکھلائے اشرفی خورشید — جس کو مرّیخ نذر دے خنجر
پیش کش ہے یہ مطلعِ ثانی — کہ قلم ہے رواں بطرزِ دگر

مطلع ثانی

اے قمر چہرہ آفتاب افسر — اے فلک مرتبہ زمیں کشور
اے ترا فہم رونقِ تدبیر — اے تری رائے عقل کا زیور

تیرے دم سے جہاں کا باغِ اُمید — سبز و شاداب اور تازہ و تر
تیرے فیضِ کرم سے ارزانی — فقرا کو بھی دولتِ قیصر
بانگِ پرقہر سے تری پیدا — ایک سناٹا دشت کے اندر
مژدۂ مہر سے ترے برپا — شہر میں غلغلِ طرب گھر گھر
جب کہ بجتی ہے تیری نوبتِ صبح — گونج اُٹھتا ہے گنبدِ بے در
ذکرِ انصاف کا ترے سن سن — ظلم خود کانپتا ہے اب تھر تھر
پھیرے انسان ملزمِ دُزدی — گر ترے عہد میں چرائے نظر
ہے ترے احتساب کے ڈر سے — شکلِ خوناب بادۂ احمر
غیر واجب بیاں نہ تم کو پسند — ظاہر آرائی کا نہیں خوگر
مدعا عرضِ فنِّ شعر نہیں — شرحِ احوالِ واقعی ہے مگر
ہو گیا اتفاق سے مجبور — کیا میں نے جو اختیارِ سفر
ورنہ دوری کسے گوارا تھی — مجھ سے اور چھوٹ جائے تیرا در
میں نمک خوار تو ولی نعمت — میں تہی دست تو کرم گستر
ہے وہی آستاں مرا مرکز — آسماں گرچہ لاکھ دے چکّر
کہ رہا بندہ وار مدّت تک — الفتِ خاص سے ترے در پر
اب ترے التفاتِ بے حد کی — یاد میں کر رہا ہوں عمر بسر
طوطیِ ہند ہے زباں میری — اور ترا ذکرِ خیر ہے شکّر

نہ مجھے حرص درہم و دینار
نہ مجھے آرزوئے لعل و گہر

چاہتا ہوں فقط یہی کہ رہے
گوشۂ چشمِ التفات اِدھر

پھر یہی کہہ رہی ہے کثرتِ شوق
کہ پئے ہم رہوں ثنا گستر

نہ کوئی بذل میں ترا ہمتا
نہ کوئی عدل میں ترا ہمسر

ہر پیادہ ترا تہمتن تن
ہر سپاہی ترا مظفر فر

سرِ دشمن بنے گُلِ نیزہ
خونِ اعدا ہو جوہرِ خنجر

رہے جب تک جہاں میں زیبائش
رہے جب تک جہاں کو زیبِ دگر

تو ہو فرماں روائے اہلِ جہاں
اور اہلِ جہاں ہوں فرماں بر

دوستوں کو مدام عیش و نشاط
دشمنوں کو ہمیشہ خوف و خطر

(۲) قصیدہ ناتمام[1]

دکھاؤں شاہدِ مضموں کی چینِ پیشانی
کہ ہووے چشمۂ آئینہ غرقِ حیرانی

جو دیکھے جنبشِ لب ہائے جاں فزا اُس کی
تو فرطِ شرم سے آبِ حیات ہو پانی

چمن میں گر وہ سراپا بہار جا نکلے
تو خارِ خارِ چمن بھی کرنے گُلستانی

جمال و حسن یہی ہے تو ایک دن میں بھی
بُلا کے خلوتِ دل میں بہ رسمِ مہمانی

[1] بمقام سہارنپور ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔

حضورِ عالی .... خاں صاحب　　کہوں کہ آج دکھا جو ہنرِ ثنا خوانی
کہ جس کی رائے بہ آئینِ ملکی و مالی　　معینِ رسمِ جہاں داری و جہاں بانی
اب اُس کے عہدِ عدالت میں ظلم ہی نہ رہا　　غلط ہے یہ کہ بنا ید ز گرگ چوپانی
سُنا جو شہرۂ انصاف و داد خود آئی　　عدالت ازپئے پابوس۔ ہوکے دیوانی
بوقتِ صولت و سطوت نگاہ برقِ بلا　　دمِ سخا و کرم۔ ہاتھ ابرِ نیسانی

طریقِ داد میں پیدا ہے عدلِ فاروقی
امورِ دین میں ظاہر حیائے عثمانی

قصیدہ (۳۰)

ایک پرانے مسودے میں سے یہ چند اشعار مل گئے جو یہاں درج ہیں۔ یہ قصیدہ میرے مرحوم دوست ڈپٹی نجم الدین صاحب دہلوی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ (مرتبہ ۱۸۷۰ء)

رنگِ فریب سادگیِ دل میں ہے نہاں　　افزائشِ یقیں نہیں بے کاہشِ گماں
دل تنگ ہے کثافتِ چار آخشیج سے　　باطن میں گو لطائفِ ستّہ ہوں رواں
ہے پردہ پوش دیوِ بد آموز آشکار　　فرخ سروش اُٹھائے اگر برقعِ نہاں
خاطر نشاں نہ ہے غفلتِ عیشِ معاصریں　　گر دل نشیں ہے عبرتِ حالِ گزشتگاں
وہاں دست بردِ جہل بھی وہم آفریں نہیں　　جس میکدہ میں پائے خرد ہو نہ درمیاں
آسائشِ کدورتِ باطن ہے وہ بلا　　سعیِ صفائے قلب کو سمجھے بلائے جاں

دل میں ہجومِ وسوسہ پیدا کرے خطر
خاطر پہ گر سرایہ مکتوبہ ہول عیاں

ہو تیرگیِ جسم کو یہ خاکداں فضا
زنداں ہو بہرِ روح جو یہ تیرہ خاکداں

غفلت کو ہو بقیۂ دِ دروزہ پر غرور
اندیشہ کو اگر ہو غمِ عمرِ رائگاں

تھا دل میں حشر و نشرِ تخیّل یہی کہ جہل
بالیں پہ میرے بیٹھ گیا آکے ناگہاں

کہنے لگا تجھے نہ دکھاؤں گا تا بہ حشر
علم و کمال و فضل کے ثمرہ میں عز و شاں

اے خفتہ بخت طالعِ بیدار کی طرح
تجھکو ملے نہ دولتِ بیدار کا نشاں

سُرمہ ہو یا ہو خال مگر تیرہ روزگار
تجھ سا نہ نکلے ہند سے لے تا باصفہاں

ملجائیں خاک میں ترے افکار دور بیں
ثابت بھی گرچہ کردے تو خرقِ آسماں

شعلہ کی طرح تجکو میں بےتاب ہی رکھوں
اور آگ کی مثال تہِ ظلمتِ دخاں

سینہ کو تیرے چاک کروں میں برنگِ گُل
لیکن بنا کے داغِ تمنّا سے گلستاں

شبنم کی طرح تجکو رولاؤں دمِ سحر
خوں میں کفن بناؤں سرِ شام لالہ ساں

پایانِ کار ایسا بنے ننگِ روزگار
بیٹھے جو تو کہیں تو اُٹھے شورِ الاماں

رہ جائے ایسا بیکس و بےیار و بےدیار
ہو کوئی تیرا دوست نہ مونس نہ مہرباں

کیا تاب ہے کہ تو مرے چنگل سے چھوٹ جائے
اور چھوٹ جائے بھی تو بھلا جائیگا کہاں

امضا پذیر جانبِ مغرب ہے میرا حکم
مشرق میں بھی ہے سکّہ مرے نام کا رواں

سرحدِ خاکِ چین سے اقصائے روم تک
تیغ و نگیں ہے مجکو مسلّم بہر زماں

میں حالتِ سکوت میں سنتا رہا بغور
اُس یاوہ گو کی ہرزہ و بےصرفہ داستاں

کافور ہو گئے وہ خیالاتِ سابقہ
چلنے لگی زباں کہ مری طبع تھی رواں

اے جہل روسیاہ و تبہ کار و لاف زن
گو بخت واژگونہ و بے مہر آسماں

لیکن تجھے خبر بھی ہے کس کا دور ہے
ہے آج کون داورِ دارائے داوراں

اے جہل اُس کے ظلِ حمایت میں ہیں ہم آج
ہے جس سے پرچمِ علمِ علم زر فشاں

آسودہ زیرِ سایۂ فیضِ عمیم ہوں
وہ سایہ جس کے سامنے خورشید ہے کتاں

چمکا ہے یہ ستارۂ علم ان دنوں کہ ہیں
جلبابِ لیل میں سبق آموز روشناں

کچھ روشنانِ چرخ ہی پر کیا مدار ہے
مرغانِ گلستاں میں بھی ہے درسِ بوستاں

اک درس بوستاں پہ نہیں منحصر سبق
نہر الفصاحت اُن کے لیے جدولِ رواں

ہر جدولِ رواں میں ہے طغرائے دل فریب
یعنی کہ سبزہ تازگی افزائے جسم و جاں

سبزہ سے ہیں معانیِ بیگانہ آشکار
کیا متن گلزمیں ہے پئے مرغِ صبح خواں

لمعانِ آفتاب سے جوں رنگ شب اڑے
کھویا فروغِ علم نے یوں جہل کا نشاں

پیدا ہے شوقِ علم کہ کرتا ہے روز و شب
خورشید بھی مساحتِ ساحاتِ آسماں

شب گرچہ کم سواد ہے پر نورِ علم سے
اس نے بھی ہیں مسائلِ ہیئت کیے بیاں

بھر بناتِ نعش معلّم ہے چرخِ پیر
روشن اسی غرض سے ہے شمعِ ستارگاں

اب کر دیا ہے سیرِ کواکب نے آشکار
تھا رازِ علم گنبدِ افلاک میں نہاں

اے معدلت پناہ و پناہِ جہانیاں
سرمایۂ فضیلت و علامۂ زماں

خورشیدِ مجد و شمعِ شبستانِ مکرمت
نیسانِ جود و ابرِ بہارانِ امتناں

عز و جلال و جاہ میں بیدا ہے بے قیاس — فضل و کمال و علم میں دریائے بے کراں
ہے تیرا دستِ جود کفِ بحر سے وسیع — پایۂ علوئے مرتبہ بالائے فرقداں
تدبیرِ مملکت میں تری رائے معتبر — قانونِ سلطنت میں ترا فہم نکتہ داں

زیبا ہے تجکو طبل و علم پرچم و لوا
شایاں ہے تجکو خیل و خدم لشکرِ گراں

(۴) خشک سالی؎

نہ آئی - پر نہ آئی پر نہ آئی — گھٹا نے بولدی بالکل صفائی
اگر آئی تو کی لے دے ہوا نے — سواری اور جانب کو بڑھائی
گئے دریا اُتر - تالاب سوکھے — کجا ئی ابر دریا دل کجائی؟
نہ صحرا میں دل آویزی کا انداز — نہ بستاں میں ادائے دل کشائی
نہ صحنِ باغ میں طوطی کا نغمہ — نہ شاخِ گل پہ بلبل چہچہائی
زمین چٹیل ہے کورا آسماں ہے — ہوئی اب کے برس اچھی صفائی
نہ روئے مل کے ساون اور بھادوں — ہوئی ہے ترک باہم آشنائی
نہ تانا شامیانہ ابر تو نے — نہ اب کے رعد نے نوبت بجائی
نہ وہ جگنو نہ وہ راتیں اندھیری — نہ وہ کالی گھٹا گھنگور چھائی
نہ پرنالے چلے اب کے دھڑ ادھڑ — نہ گزری کی سڑک رونے بہائی

؎ مرتبہ ۱۸۷۷ء

نہ وہ سن سن نہ وہ جھونکے ہوا کے
نہ بجلی نے چمک اپنی دکھائی

نہ وہ برسات کے کیڑے پتنگے
نہ مینڈک نے زمیں سر پر اٹھائی

کہاں بادل کہاں بجلی کہاں مینہ!
پریشانی سی ہے دنیا پہ چھائی

نہ اے [illegible] بادل جھمرن برسائی تو نے
نہ اے ساون جھڑی تو نے لگائی

نہ موروں نے کیا کچھ شور برپا
نہ کویل ہی نے دھوم اب کے مچائی

نہ ٹپکیں بوندیاں پتوں سے ٹپ ٹپ
نہ دلکش راگنی چڑیوں نے گائی

نہ رنگا رنگ بادل آسماں پر
نہ چھت پر گھاس دیواروں پہ کائی

نہ کیچڑ ہے نہ پانی ہے نہ سبزہ
نہ مینہ برسا نہ کھیتی لہلہائی

ترستے ہیں برستا ہی نہیں مینہ
سسکتی ہے پڑی ساری خدائی

بہت رو کر دعائیں سب نے مانگیں
گھٹا روئی نہ بجلی مسکرائی

ہوئی برباد کھیتی تھک گئے بیل
گئی گزری کسانوں کی کمائی

نہیں بیچارے حیوانوں کو چارہ
ہے انسانوں کو فکر بینوائی

بہت مزدور بیٹھے ہیں نکمّے
نہیں اب کوئی حیلہ جز گدائی

سمندر کیا ہوئے تیرے بخارات
صبا! تو کیوں اڑا کر لے نہ آئی

بلائے قحط ہے ہندوستاں میں
ہے روم و روس میں برپا لڑائی

خدایا جلد قحط اور جنگ ہوں دور
ملے سب کو مصیبت سے رہائی

خدایا رحم کر۔ جاں لب پہ آئی
تری مخلوق دیتی ہے دہائی

(۵) عیدیٔ شبِ برات[1]

بگڑی ہے کیا انار پٹاخوں کی اب کے بات
ساون میں اتفاق سے آئی شبِ برات

بارود ہے خراب پٹاخے ہیں پھسپھسے
کم زور ہیں انار چھچھوندر ہے واہیات

مہتاب میں مزا ہے نہ کچھ پھلجھڑی میں لطف
پیسے ہمارے مفت گئے یوں ہیں آٹھ سات

پیسے گئے فضول تو خیر اس کا غم نہیں
ہے سال بھر کے کھیل کی گویا یہی زکوٰۃ

پاتا ہے اس جہان میں کچھ کھو کے آدمی
آئندہ ایسے کھیل پہ ماریں گے ہم بھی لات

بس چھوڑو کھیل کو دکہ حلوا ہے گرم گرم
شامل ہے جس میں ذائقۂ قند اور نبات

شیریں ہے خوش قوام ہے چٹ کیجئے اسے

---

[1] سنہ ۱۲۹۵ھ مطابق ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۷۸ء موافق ساون سمت ۱۹۳۵

حلوہ کی چاشنی سے ہے مصری بھی آج مات
بدعت کہو گناہ کہو۔ یا چٹورپن
اچھا نہیں سمجھتا اسے زمرۂ ثقات
بچوں کے واسطے ہے خور و نوش کھیل کود
اصحابِ اتقا کے لئے صوم اور صلوات
جاگیں گے آج اہلِ عبادت تمام شب
درگاہ کبریا سے کریں گے طلب نجات
سرکارِ حق میں پیش حساب و کتاب ہے
تقسیم رزق اور رقمِ موت اور حیات
اس واسطے دعا و طلب میں مبالغہ
کرتے ہیں تاکہ اُن پہ زیادہ ہو التفات
اہلِ نظر ہیں وہ کہ جنھیں یہ خیال ہے
کیا مانگیے کہ ہیچ ہے یہ جملہ کائنات
برکت ہے اپنے حال میں نئے ماہ و سال میں
ہردم عیاں ہے ذات وہی باہمہ صفات
کیا ذات کیا صفات نہیں فرق و امتیاز
ہے ایک حال ایک نظر اور ایک بات

صاحب نظر کو فرقِ شب و روز کچھ نہیں
ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شبِ برات
جو کچھ کہ ہے خیال میں خواب و خیال ہے
لے کر ازل سے تا بہ ابد کُل معاملات
سرکار کے بنائے ہوئے ہیں یہ سب عدد
اور عالمِ شہود ہے گویا شبِ برات
بارود ایک سی ہے مگر وزن ہیں جُدا
ہیں مختلف ظہور میں آثار اور صفات
سہرہ ہو پھلجھڑی ہو پٹاخا ہو یا انار
سب میں بھری ہوئی ہے وہی ایک پاک ذات
ہر چیز کا ہے وزن معیّن جنچا تُلا
اِک آن کی نمود ہے بے اصل و بے ثبات
چھُٹنے کے بعد پھر نہ رہا یہ نہ وہ رہا
آخر کو ڈھاک کے نظر آتے ہیں تین پات
جو زور شور تھا سو حقیقت میں کھیل تھا
جب ہو چکا تمام یہ سرمایۂ حیات
دِکھلا کے اپنا رنگ فنا ہو گئے تمام

عقل و قیاس و فکر و خیال و توہمات
ہے اصلِ نور و نار فقط ذات بے نشاں

دھوکا نگاہ کا ہے قیود تعیّنات
مستور ہے ظہور میں ظاہر بطون میں

بے رنگ و بے نشان ہے بے کیف و بے جہات
شانیں جُدا جُدا ہیں تجلّی تو ایک ہے

کعبہ ہو ہردوار ہو یا دیرِ سومنات
عیدی ہو یا قصیدہ۔ رباعی ہو یا غزل

معنی میں مشترک ہیں بکثرت ہیں گو لغات
ظاہر میں شاعری کا زٹل قافیہ سہی

فہمِ درست کو یہ لطائف ہیں اور نکات
حامد شبِ برات کی عیدی ہے با مزہ

لکھوانی چاہتے ہو۔ تو لاؤ قلم دوات

(۶) عید[۱] الفطر

اب کے رویت میں آگیا ہے خلل — رمضاں ایک اور عید ڈبل
یعنی اُنتیس تیس اٹھائیس — کیا تواریخ میں پڑا ہے بل

[۱] مرتبہ سنہ ۱۸۸۰ء

آج چلّھی کسی نے افطاری — کوئی روزہ ہی کو گیا ہے نگل
دی کسی نے شہادتِ کامل — کوئی سمجھا اُسے کہ ہے یہ زٹل
نو بجے دن کے بج گیا دیونسہ — روزہ داروں میں پڑگئی ہل چل
خشکیِ روزہ شدّتِ گرمی — کر رہی ہے دماغ کو مختل
آج برپا ہے عام جوش و خروش — ہوئی آپس میں خوب ردّ و بدل
جا پڑا دیوبند میں پہلے — چاند کا بھی گیا تھا پانوں پھسل
ایک دن تک وہیں رہا ناچار — سب کی آنکھوں سے ہو گیا اوجھل
کہیں جھگڑا کہیں لڑائی ہے — ایک کو غصّہ ایک کو جھونجھل
کوئی سمجھا رہا ہے مُلّا جی! — کس لئے کر رہے ہو جنگ و جدل
گو اٹاوہ میں چھپ گیا فتویٰ — علما کا نہیں ہے اُس پہ عمل
بست و ہفتم کو چاند دیکھ لیا — خود غلط تھی شہادتِ اوّل
دیکھ کر اختلاف دُنیا کا — یاد آئی ہے مجھ کو ایک مثل
کون سی ہے مجھے بتا تو سہی — اونٹ رے اونٹ تیری سیدھی کل
چاند کے اختلاف نے اب کے — میری عیدی کو کر دیا مہمل
کیوں پڑے ہو تم اِس بکھیڑے میں — ہوا جو کچھ بھی تھا حکمِ ازل
ہیں زمانے کے کام رنگا رنگ — نہ ہُوا ہے نہ ہو یہ عقدہ حل
نہیں چون و چرا کی گنجائش — لنگ ہے اِس جگہ پہ رخشِ علل

عید کے واسطے نہیں درکار — قمر و مشتری و شمس و زحل
مدّتِ دھر آنِ واحد ہے — غلطی پر ہے دیدۂ احول
ہے یہ نیرنگ کی نمودار ی — آسمان و زمین مکان و محل
ختم روزے ہوئے نماز پڑھو — بعد حمدِ خدائے عزّ و جلّ
عید ہی عید ہے کوئی دن ہو — ہم کو یکساں ہے پیر اور منگل

وہی ظاہر ہے اور وہی باطن
وہی آخر ہے اور وہی اوّل

(۷) نذرانہ پیرجی[1]

قعرِ دریا میں نہ طوفاں ہے نہ موج و گرداب
خشک ہے آبِ رواں بحر میں قطرہ نایاب
نہ تو حاصل میں طلب ہے نہ طلب میں حاصل
ضبط ہیں جملہ سوال - اور ہیں بیہودہ جواب
نہ پتا ہے نہ ٹھکانا نہ کوئی راہ و مقام
یعنی الآن کما کان نہ مبدا نہ مآب
نہ ادھر کوئی مزہ ہے نہ اُدھر بدمزگی
رونقِ صومعہ باقی نہ خرابات خراب
ہیں تو ہر قسم کے مطلب مگر اس نسخہ میں

[1] پیرجی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل و رئیس لدھیانہ مصنف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے جنکے واسطے یہ نذرانہ ۱۸۹۱ء میں مرتب کیا گیا۔

نہ کوئی لفظ نہ جملہ۔ نہ کوئی فصل نہ باب
بھوکے مرتے ہیں شکم سیر۔ پیاسے ہیں غریق
خاک صحرا میں نہیں آب کے جویا تالاب
ایک ثمرہ ہے یہاں غفلت و آگاہی کا
خواب اعمیٰ ہے مگر حالتِ بیداری و خواب
وہی ہوتا ہے جو پہلے سے ہوا رکھا ہے
نہ طریقہ ہے خطا کا نہ کہیں راہِ صواب
نہ تو بے کار تسلّی ہے نہ آرام بکار
نہ سفینہ ہی رواں ہو نہ یہ دریا پایاب
خواہشِ وصل غلط۔ سعیِ تقرّب بے سود
نہ کوئی واسطہ حائل ہے نہ پردہ نہ حجاب
نہ مکاں ہے نہ در و بام ہے ویرانہ میں
بُتکدہ ہے نہ کلیسا ہے نہ طاق و محراب
نہ کوئی دوست نہ دشمن نہ مخالف نہ رفیق
نہ کوئی قابلِ رحمت۔ نہ سزاوارِ عتاب
یہ نہیں وہ بھی نہیں کہتے ہیں کہنے والے
اور جو پوچھو کہ وہ ہے کیا؟ تو نہیں کچھ بھی جواب

آج نذرانہ یہ تعجیل کیا ہے تیّار
منتظر ریل کے ہیں پیر معلّٰی القاب

(۸) نذرانہ پیرجی[۱]

نہ جدائی ہوئی کبھی نہ وصال — ہے یہ قرب و وصال وہم و خیال
کنجِ وحدت ہے غیر سے خالی — کہ گمانِ دوئی ہے امرِ محال
بحرِ وحدت میں سب ہیں مستغرق — روح و جسم و حواس و علم و کمال
جنبشِ موج ہے یہ ہنگامہ — شادی و رنج و خرّمی و ملال
نقش بر آب ہیں یہ سب حرکات — ذکر و فکر و وظائف و اشغال
کیا ہے اِس جدّ و جہد سے حاصل — ثمر و سبزہ نہر و نخل و نہال
نہ یہاں شاہدی نہ مشہودی — دست بے یارہ پائے بے خلخال
ہے یہاں نسبت و اضافت ہیچ — ہستی و نیستی بھی ہے پامال
نہ بدایت ہے نے نہایت ہے — نہ امیدِ بقا۔ نہ بیمِ زوال
نہ تو مسلک۔ نہ منزلِ مقصود — نہ طریق و روش نہ راہ و مجال
آنِ واحد ہے جو ہوا سو ہوا — وقتِ ماضی یہاں نہ استقبال
جنس خود مشتری و خود قیمت — مشتری خود ہے جنس کا دلّال
عشق گوہر نے کر دیا مفلس — ورنہ کانِ گہر ہے مالا مال

[۱] پیرجی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل و رئیس لدھیانہ مصنف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے جن کے واسطے یہ نذرانہ مرتب کیا گیا۔

طلب و جستجو ہے گمراہی — شوق پرواز نے بچھایا جال
نہ بے تعلق نہیں تلاش و طلب — بے تخیل نہیں ہے فکر نال
رہنمائی ہے وجہ راہزنی — ہو گئے نامہ و پیام وبال
کی جو فکر و قیاس نے حرکت — ہوئی پیدا شبیہ و شکل و مثال
خالقیت ہے باعثِ مخلوق — موجبِ نقص ہو گیا ہے کمال
بعد ہے قرب کی طلبگاری — جمع نے تفرقہ دیا ہے ڈال
کامیابی ہے وجہ ناکامی — بحر اور اشتیاقِ آبِ زلال
تپشِ آفتابِ وحدت سے — جلتے ہیں مرغِ عقل کے پر و بال
دل ہے گویا زبان ہے خاموش — سطحِ میداں فراخ و تنگ مجال

اس خرافات کو کریں منظور
پیرِ لدھیانوی گرو گھنٹال

(۹) جریدۂ عبرت

عذرِ تقصیر۔ ابتدائی اشعار سے ظاہر ہے کہ اس ناچیز قصیدہ کے موزوں کرنے کا خیال کس طرح میرے دل میں پیدا ہوا۔ اُس وقت طبیعت پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس نے اِس ہرزہ گوئی پر مجبور کیا ورنہ مجھکو نہ شعر و شاعری سے رغبت نہ اس فن کی مہارت نہ اتنی فرصت

اور سچ یہ ہے کہ نہ اِس کام کی لیاقت جو کچھ لکھا گیا صرف مقتضائے طبیعت تھا۔ اقتباس از دیباچہ طبع اول۔ یکم نومبر ۱۸۸۵ء

میں شاعرانہ روش پر نہیں قصیدہ نگار
یہ ایک سادہ گزارش ہے یا اولی الابصار
کہ اب کے ماہِ محرّم کی ساتویں تاریخ
گیا جو گھر سے قضارا ! بجانبِ بازار
تو دیکھتا ہوں کہ گزری میں ایک اکھاڑہ ہے
اور اتنی بھیڑ کہ جس کا نہیں حساب و شمار
ہیں دو حریف مقابل لئے پھری گتکا
ہر ایک فن پھکیتی میں طاق اور طرّار
جو اس نے پاؤں بچایا تو اُس نے سر تاکا
دکھایا چہرہ تو پہلو پہ جا کیا ہے وار
عجیب ٹھاٹھ نئے پینترے غضب پھرتی
نرالے ڈھنگ سے کرتب کا کرتے ہیں اظہار
چلا ہے ایک بنیٹی کا باندھ کر چکّر
کھڑا ہے ایک لئے سیف لڑ رہا ہے گو ہار

میں اپنے دل میں لگا کہنے کیا حماقت ہے
مٹے ہوئے ہیں جو اس فن پہ یہ خدائی خوار
یہ کھیل محض نکمّا ہے بلکہ بیہودہ
جو دیکھتا ہے۔ سو ہنستا ہے زیرلب ناچار
سپہ گری کا یہ فن تھا کسی زمانہ میں
نہ وہ زمانہ رہا اب۔ نہ صورتِ پیکار
کہاں ہیں اب وہ دلیرانِ صف شکن باقی
کہ اِن فنون پہ ہوتے تھے جان و دل سے نثار
ہزار سے نہ دبے لاکھ سے نہ منہ موڑا
جو ڈٹ گئے کسی میداں میں کھینچ کر تلوار
نہ اب بکیت کو پوچھے کوئی۔ نہ راوت کو
نہ تیر ہے نہ کماں ہے نہ بانک ہے نہ کٹار
نہ اِس کمال کی پرسش نہ اس ہنر کی قدر
نہ جنگ کا یہ طریقہ رہا۔ نہ یہ ہتیار
نہ جس میں دین کا ہو فائدہ نہ دُنیا کا
تو پاس پھٹکے نہ اُس کام کے کوئی ہُشیار
جواب دل نے دیا یوں۔ کہ مت تعجب کر

میں اس سے بڑھ کے سناؤں زمانہ کے اطوار

شاعر

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت
کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑئے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضموں
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت
نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ
کہ جھوٹ موٹ کے بنجائیں ایک عاشقِ زار
تمام اگلے زمانہ کا ہے یہ پس خوردہ
کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جس کی سو سو بار
کمال اپنا سمجھتے ہیں خود ستائی کو
نہ ننگ ہے نہ حیا ہے نہ شرم و غیرت و عار
جو اپنے فخر پہ آئیں۔ تو بس کریں تسخیر
حدودِ ہند سے لے تا بفارس و تاتار
ہے ایک غار میں پانی سڑا ہوا لبریز

پڑا ہے نیم کا پتّہ اور اُس پہ پشّہ سوار
وہ پشّہ آپ کو سمجھا ہے نا خدائے جہاز
اور اُس سڑے ہوئے پانی کو لجّہ۔ زخّار
اسی طرح سے ہمارے زمانہ کے شاعر
سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عینِ وقار
مبالغہ ہے تو بیہودہ عقل سے خارج
ہے استعارہ تو بے لطف اور دور از کار
کیا ہے نام زٹل قافیہ کا اپنے سخن
وہ کنکری ہے جسے کہتے ہیں دُرِ شہوار
جو ان کے دیکھیے دیواں تو بور کے لڈّو
غلیظ و گندہ سراسر نتیجۂ افکار
وہی ہے شاعرِ غرّا جو بے تکی ہانکے
یہی ہے شعر کا اس دور میں بڑا معیار
یہ اِن کی طبع بلند اور معنیِ رنگین
جو طبع گِد ہے تو معنی سڑا ہوا مُردار
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی
غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقت بخار

نمونہ غزل

صفت ہے دوست کی جلّاد و ظالم و غدّار
ستم شعار۔ دل آزار بے وفا ۔ مکار
ہے دلبروں کی بھی شامت نہ منہ رہا نہ کمر
بجائے زلف کے دو اژدہوں کی ہے پھنکار
یہ آپ کے گُلِ عارض وہی ہیں باسی پھول
پڑی ہے نزع کی حالت میں نرگسِ بیمار
جو ٹون ہال کی محراب ہے خمِ ابرو
تو ہے مژہ بھی پولیس کے سپاہیوں کی قطار
زنخ کنواں ہے کہ جس میں ڈبو چکے لٹیا
بھنور ہے ناف۔ کہ جس سے نہ ہوگا بیڑا پار
شبِ فراق کا دکھڑا اگر کریں تحریر
تو ایشیا کو ڈبو دیوے دیدۂ خوں بار
وہی لنڈوری ہے قمری۔ تو پر نُچی بلبل
وہی ہے سرو کا ٹھنٹھ اور طولِ قامتِ یار
جو ناصحوں سے ہے کھٹ پٹ تو زاہدوں سے چخ
جو ساقیوں سے لگاوٹ تو مغبچوں سے پیار

غریب شیخ پہ ہر دم دولتیاں جھاڑیں
کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار
کہاں ہے ان کا ٹھکانا۔ کدھر ہے ان کا مقام
وہی ہے بیت صنم اور خانۂ خمّار
بگھارتے ہیں تصوّف تو کون دے گا داد
کہاں ہیں سعدی و حافظ۔ سنائی و عطّار
کریں گے اس قدر ایمان و دین کی تفضیح
کہ گویا ہیں کوئی ہفتاد پشت کے کُفّار
اگرچہ ہاتھ میں تسبیح لب پہ ہو توبہ
بنینگے شعر میں ہاں مے پرست و بادہ گسار
ہے چرخ پیر تو مدّت سے شاعروں کا پیر
پہ کوستے ہیں اسے یہ مُرید ناہنجار
جمال یوسف و اعجاز عیسیٰ و موسیٰ
ہیں ان کی گندہ دہانی کے سامنے سب خوار
نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیا کا ادب
یہ ان کی نور بھری شاعری!! خدا کی مار
ہے ان کی طبع دنی عنکبوت کا جالا

اور ان کی بندشِ مضموں ہے مکھیوں کا شکار
کسی عمارتِ رسمی کا گربیان کریں۔
محیط کون و مکان اُس پہ تنگ ہو ناچار
جو اُس کی نیو ہو گاؤ زمین کے سم سے پرے
تو اُس کا کنگرہ بالائے گنبدِ دوّار
وہ توڑتے نہیں لقمہ مبالغہ کے بدوں
بغیر بہنگی کے جس طرح چل سکے نہ کہار
سدا دروغ کی کرتی ہیں مکھیاں بھن بھن
چپک رہا ہے لبوں پر جو شیرۂ گفتار
لکھیں جو قصّہ تو دیو و پری کا افسانہ
لگا دیں کذب کے ڈھیر اور جھوٹ کے انبار
کریں چڑیل کو حورانِ خلد سے نسبت
بنائیں اونٹ کٹیلی کو گلشنِ بجار
جب اِن پہ ہوتے ہیں مضمونِ مبتذل وارد
تو گویا عرش سے اُتری چمار کو بیگار
کریں جو مدح کسی چرکٹے کی وہ بالفرض
تو پھر سکندر و دارا ہیں اُس کے باج گزار

بنائیں اُس کے تئیں بر و بحر کا سلطاں
جو فی المثل ہو کسی کو ردہ کا نمبردار
لکھیں وہ دھوم کہ ہو گرد جشن جمشیدی
جو رقعہ شادی کا لکھوائے کوئی ساہوکار
بنانا پر کا کبوتر تو ہے بہت آسان
سوئی کو پھاوڑا کہنا تو کچھ نہیں دشوار
ہے سچ تو یہ کہ انھیں شاعروں کے قالب میں
لیا ہے جھوٹ نے کلجگ میں آن کر اوتار
مشاعرہ ہو۔ تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مرغ
لہولہان ہیں پنجے شکستہ ہے منقار
وہ خود فروش بنے آج اوستادِ زماں
کہ جن سے کوئی ٹکے سیکڑا نہ لے اشعار
اگر سُنیں کہ ہوا ہے فلاں رئیس علیل
تو پہلے قطعۂ تاریخ کر رکھیں تیّار
اُجڑ گئے ہیں وہ تھان اور لد گئے ڈیرے
جہاں کُداتے تھے یہ بھانڈ کا غذیں رہوار
جہاں خوشامدیوں۔ شاعروں کی تھی بھرتی

اب ایسی کاٹھ کی اُلّو نہیں کوئی سرکار
تو اب وہ پھرتے ہیں ناچار مانگتے کھاتے
بنا کے کاسہ گدائی کا پرچۂ اخبار
کسی کی مدح سرائی کسی کی بدگوئی
اڈیٹری کی بھی کرنے لگے ہیں مفت خوار
کلام دیکھو تو صورت حرام سرتاسر
سلاح بردر دکس نیست درمیان حصار

فلسفی علما

نہ شاعروں ہی پہ تنہا پڑے ہیں یہ پتھّر
کہ عالموں کا بھی اس دور میں یہی ہے شعار
وہیں ہیں آج۔ جہاں تھے یہ دس صدی پہلے
گیا ہے قافلہ دور۔ اب ٹٹولتے ہیں غبار
وہی ہیں یاد پرانے اصول یونانی
جنھیں علوم جدیدہ نے کر دیا بے کار
وہی قدیم زمانہ کا فلسفہ ٹیڑھا
ہو جیسے کہنہ کھنڈر کی ڈھئی ہوئی دیوار
ہنوز فخر و مباہات اس پہ کرتے ہیں

وہ جن کے سر پہ فضیلت کی ہے بندھی دستار
ہے درس میں وہی ترتیب مادّہ اب تک
کہ پہلے خاک ہے پھر آب - پھر ہوا پھر نار
اگرچہ ہو گئے تحلیل خاک و باد اور آب
مگر ہیں علم میں ان کے وہی عناصر چار
ہے آسمان طوافِ زمین میں مصروف
ہے آفتاب ابھی چرخِ چارمیں پہ سوار
وہی ہے ڈھانچ پرانا نظام ہیئت کا
جڑے ہوئے ہیں فلک میں ثوابت و سیّار
وہی ہے مسئلہ خرق و التیام ہنوز
کہ جس کا اب نہ کوئی مدعی نہ جانب دار
وہی حساب ہے لکھا ہے جو خلاصہ میں
گھٹے بڑھے گا نہ اک صفر تا بروزِ شمار
جو کہہ گئے ہیں فلاطوں اور بطلیموس
اسی کی بحث ہے اب تک اسی کی ہے تکرار
جو شرح چغمنی و میبذی میں لکھا ہے
ز روئے کشف کھلے تھے وہ غیب کے اسرار

جو شمس بازغہ میں آچکا سو ہے الہام
کہ ہے مسائلِ حکمیّہ کا اسی پہ مدار
بھرا ہوا انھیں کج بحثیوں سے ہے منطق
کہ ایک کو جو کہیں دو تو پھر نہ ہو انکار
ہوا دلائلِ وہمیّہ سے جو کچھ ثابت
تو پھر مشاہدہ بے سود تجربہ بے کار
نہ جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ شکل کھانے کی
وہ کھائے بیٹھے ہیں اشکالِ منطقی پہ اُدھار
دماغِ خشک میں اُن کے جو کچھ سمایا ہے
اُسی کی پیچ ہے وہی ڈینگ اور وہی اصرار
بسی ہوئی ہے ابھی تک وہی پُرانی بو
کچھ ایسی پی ہے کہ گھٹتا نہیں ہے جس کا خمار
ہیں عاقلوں کے لئے آیتِ خداوندی
یہ آسمان و زمیں اور نجومِ پُر انوار
نہیں ہے گوشۂ خاطر کا اِس طرف میلان
کہ غور کیجئے قدرت کے دیکھ کر آثار
ہے کِس طریق پہ ارض و سما کی پیدائش

ہے کس کے قبضہ میں جمازۂ جہاں کی مہار
ہے موسموں کی بھلا یہ اُلٹ پلٹ کیوں کر
کبھی عمل ہے خزاں کا کبھی ہے دخلِ بہار
کبھی کا دن ہے بڑا اور کبھی کی رات بڑی
یہ کس روش سے ہُوا اختلافِ لیل و نہار
یہ کس نے پھیر دیا موسمی ہَوا کا رُخ
یہ کیوں ہے بادِ تجارت کی متصل رفتار
نسیم برّی و بحری میں چھیڑ چھاڑ ہے کیوں
کہ رات دن نہ اِسے چین ہے نہ اُس کو قرار
ہُوا ہے بحر سے کیوں کر ہوا کا دامن تر
اُڑائے تارِ شعاعی نے کس طرح یہ بخار
کیا ہے کس نے بتا وُ سحاب کو تسخیر؟
میانِ ارض و سما مثلِ طائرِ پردار
ہے کیونکہ گرم یہ ہنگامہ برف و باراں کا
سدا بروئے زمین خاص کر سرِ کُہسار
یہ اوس کیا ہے کُہر کیا ہے۔ اور بادل کیا؟
یہ بادلوں سے برستی ہے کس طرح بوچھار

دیا ہے کس نے یہ آبِ حیات کا چھینٹا
کہ لہلہائے زمیں پر ہرے بھرے اشجار
بہے پہاڑ سے چشمے رواں ہوئے دریا
اُگے نہال۔ کھِلے پھول۔ اور لگے اثمار
رواں ہے ساحتِ دریا پہ کس طرح کشتی
چڑھے ہوئے ہیں مسافر۔ لدا ہوا ہے بار
کہ جس کے فیض سے دولت سمیٹتے ہیں لوگ
اسی کے نفع سے قائم ہے فرقۂ تجّار
ہُوا ہے بحر میں کیوں کر یہ جذر و مد پیدا
یہ کیا ہیں زلزلۃ الارض۔ اور جبال النّار
دبے پڑے ہیں فِلِزّات اور جواھر کیوں؟
ہوا زمیں سے پہاڑوں کا کس طرح پہ اُبھار
ہوئی ہے کب طبقاتِ زمین کی ترتیب؟
نئی زمین بناتا ہے کون سا معمار
غرض کہ صنعتِ حق کے نکات ہیں بے حد
کہ جن سے عالمِ کون و فساد ہے سرشار
نہ اِن مظاہرِ قدرت پہ ڈالتے ہیں نگاہ

نہ اُن رموز کی تحقیق ہے نہ استفسار
ہے جن علوم سے انساں کے حال میں برکت
ہیں جن فنون سے گلزار شہر و ملک و دیار
ہیں جو علوم صنائع کے قبلۂ و کعبہ
ہے جن فنون سے حسنِ معاشرت کا سنگار
ہے جن علوم سے انساں کی زندگی سرسبز
ہیں جن فنون سے اہلِ زمانہ برسرِ کار
یہ اُن کے نام پہ کہتے ہیں د۔ ف اور ع!
یہ اُن پہ کرتے ہیں لاحول اور استغفار
یہ نعمتوں سے خدا کی ہوئے ہیں سخت نفور
یہ خوبیوں سے تمدّن کی ہیں بہت بیزار
یہ ڈھونڈتے ہیں وہی لیکھ اور وہی چھکڑا!
اگرچہ ریل کی سیٹی نے کر دیا بیدار
یہاں پڑا ہے ابھی مرغِ نامہ بر بسمل!
وہاں پیام اُڑی لے کے برق کی رفتار
رفل کے سامنے کچھ کام دے سکے گی بھلا!
پرانی وضع کی بندوق وہ بھی توڑے دار

ہلے گا ہاتھ وہ کیا! جس پہ گر چکا فالج
چلے گی تیغ وہ کب! جس کو کھا گیا زنگار
کیا ہے گردشِ گیتی نے جس کو ملیامیٹ
سمجھ رہے ہیں اُسے یہ بزرگوار حصار

معلّم

معلّموں کو جو دیکھو تو روح دقیانوس!
ہیں وہ بھی دخمۂ فارس کے استخواں بردار
وہی ہے ان کا پرانا طریقۂ تعلیم
کہ جس میں زندہ دلی کے نہیں رہے آثار
وہی خوشامدی القاب اور وہی آداب
کہ جن سے تازہ ہے انشائے دل کشا کی بہار
ہو ایک انچھ کا مطلب تو ہاتھ بھر کی دعا
اور ایک گز کی تمنّائے دولتِ دیدار
طریق ترجمہ اب تک وہی ہے اُوٹ پٹانگ!
پڑھیں جو لڑکے تو ہل ہل کے اور پکار پکار!
نہ چلنے پھرنے کی عادت نہ خو ریاضت کی
جواں ہیں پیر سے بدتر تو پیر زار و نزار

سوائے ضعفِ دماغ اور بھی مرض ہیں کئی
فتورِ ہاضمہ۔ آشوبِ چشم۔ نزلۂ حار
مکان وہ جس میں کھچاکھچ بھرے ہوئے لونڈے
ہے جیلخانہ کی مانند تنگ و تیرہ و تار
ہوئے جو پڑھ کے مکاتب میں فارغ التحصیل
تو نوکری کے لئے کر رہے ہیں سوچ بچار
نہ ایسے علم سے واقف کہ کچھ کما کھائیں
نہ ایسے فن کی مہارت کہ کر سکیں بیوپار
نہ ہو سکیں گے ملازم کسی کچہری میں
کہ اِس کے واسطے ہے مڈل کی سند درکار

طبیب

اسی روش پہ اطبّا کا ہے مرض مزمن
ہنوز نبضِ طبابت کی سست ہے رفتار
وہی سدیدی و قانون و تحفۂ و مخزن
خدا نے اِن پہ لگا دی ہے مہرِ استمرار
مجرّبات وہی اور وہی ہیں دستورات
انھیں بھی مُردہ پرستی کا ہے بڑا آزار

وہی ہے فصد وہی منضج اور وہی مسہل
وہی سناؤ گلِ سرخ و شربتِ دینار
معالجہ میں ترقی نہ کچھ مداوا میں
وہی سبب وہی تشخیص۔ اور وہی تیمار
غذا بتائیں وہی دال مونگ یا کھچڑی
بلا سے ان کی مرے یا جیے کوئی بیمار
اگر مریض کی قسمت سے ہو گیا بحران
تو راس آئی دوا۔ ورنہ اشتدادِ بخار
نہ کچھ دوا کی ہے تحقیق۔ نے دواسازی
وہی دوا ہے جو پڑیہ میں باندھ دے عطّار
نہ ٹھیک طور سے اجسام کی ہوئی تشریح
نہ تیز فنِّ جراحت کے کرسکے اوزار
نہ کیمیا کے ہوئے حل و عقد سے آگاہ
نہ مفردات کی ترکیب کے کھلے اسرار
نہ فنِّ قابلہ میں دستِ قابلیّت ہے
نہ ان کو شرحِ نباتات پر نظر زنہار
توہّمات بھی داخل ہیں یاں طبابت میں

بڑا طبیب ہے گر ہو منجّم و جفّار
نظر بروج و کواکب پہ کرکے دیئے نسخہ
کہ ہیں دوا پہ موثر نجوم کے آثار

دنیا پرست دیندار

ہر ایک علم و عمل میں پڑی ہے یہ پُٹکی
ہر ایک طرز و روش پر پڑی ہے یہ پھٹکار
امام و حافظ و واعظ مؤذّن و مفتی
نہ کوئی دین میں پورا نہ ٹھیک دنیا دار
زبس کہ دعوت و نذر و نیاز پر ہے معاش
ہوئے ہیں قوم میں پیدا بہت سے پنشن خوار
جو اینڈتے ہیں پڑے کھا کے لقمۂ خیرات
گئی حمیّت و غیرت دلوں سے اِن کے سدھار
وہ پھولتے ہیں۔ اپھرتے ہیں فخر کرتے ہیں
فقط اِسی پہ کہ ہم ہیں بڑے نماز گزار
نہ خلق نیک۔ نہ ہمّت بجا۔ نہ عزم درست
نہ حُبِّ قوم۔ نہ حُبِّ وطن۔ نہ حُبِّ تبار
لکھیں گے ٹھیک وہی اُن کا دفترِ اعمال

یہ دو فرشتے مقرّر جو ہیں یمین و یسار
تھے پہلے صاحبِ تقویٰ تو خلق کی تصویر
نہ آج کل کے سے ملّائے خشک دل آزار
کہاں ہیں دین و دیانت طہارت و تقویٰ
کہاں ہیں اگلے زمانہ کے باصفا ابرار
مدار دین ہے اس پر کہ جھٹ کتر ڈالیں
جو پائیں ٹخنے سے نیچی ذرا کسی کی ازار
فقط مسائلِ غسل و وضو و استنجا
یہی ہیں وحیِ الٰہی کے آج کل اسرار
کہیں تو ضاد کی قرأت پہ غُل غپاڑہ ہے
کہیں ہے جہر پہ آمین کے جوتی اور پیزار
کسی گروہ میں ہے ختمِ فاتحہ پر جنگ
کہیں ہے مجلسِ میلاد موجبِ تکرار
کہیں تو کفر کے فتوؤں کا چل رہا ہے گراپ
کہیں ہے طعن و ملامت کی ہو رہی بھرمار
یہ مولوی ہیں۔ کہ بغض و نفاق کے جرنیل!
کہ جاہلوں کو لڑاتے ہیں یہ سپہ سالار!

بلا سے ان کی اگر مضحکہ کریں ملحد
بلا سے ان کی اگر دین پر ہنسیں کفّار
مناظرہ کی تصانیف قابلِ نفرت
مباحثہ کی کتابیں سزائے استحقار
جبیں پہ ان کی تو ہُم کا ہے کُھدا قشقہ
کمر پہ ان کی تعصّب کا ہے بندھا زُنّار
ہیں سُنّتوں میں یہی سُنّتیں انھیں مرغوب
نکاح و دعوت و قیلولہ عُجلتِ افطار
گھٹی جو دور میں ان کے۔ تو راستی کی قدر!
بڑھی جو عہد میں ان کے تو ریش کی مقدار!
ملے ٹکا تو کریں ثبت مہر فتوے پر
غضب ہے الفتہ علیہ السّلام کی جھنکار
بنائیں حیلہ گری سے حلال رشوت کو
یہاں تو مات ہیں ان سے وکیل اور مختار
سُنائیں دوزخ و جنّت کا حال۔ لے کر فیس
ہے اس زمانہ میں چلتا ہوا یہی اوزار
یہی ہے وعظ و نصیحت کی علّتِ غائی

کہ بعد کھانے کے ملجائیں نقد بھی دو چار
نہیں ہے جن کو میسّر یہ وعظ کا لاسہ
تو کرتے پھرتے ہیں وہ اور ہتکھنڈوں سے شکار
دکھا کے فضلِ قناعت جتا کے صبرِ جمیل
وہ بھیک مانگتے ہیں بن کے حاجی و زوّار
مصافحہ کے لئے ہے یہ پیش دستی کب؟
اسی میں حُسنِ طلب ہے دیا جو ہاتھ پسار

مشایخ

بہت سے راہزنی کر رہے ہیں بن کر پیر
غریب قوم کو ہیں مارتے یہ شاہ مدار!
لیا ہے معتقدوں کی نجات کا ٹھیکہ
کہ گویا ہیں یہی باغِ جناں کے ٹھیکہ دار
ہزار دانہ کی تسبیح گیروا کپڑے
یہی ہیں ان میں علاماتِ اولیائے کبار
کسی سے نقد کہیں جنس اور کہیں دعوت
جو بس چلے تو نہ چھوڑیں مُرید کا گھر بار
یہ مومنوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں

فتوحِ غیب رکھیں اِس کا نام یا ادرار
کریں جو ذکر تو پھر ایسی بولیاں بولیں
کہ شب کو چونک پڑیں ساکنانِ قرب وجوار
جو دعوت اِن کی کریں معتقد تو ہے واجب
کہ اِن کے کھانے کو ہو شوربا بھی چھلّہ دار
اگر ہیں یاد تصوّف کی اصطلاحیں چند
تو پہونچا عرشِ معلّی پہ گوشۂ دستار
یہی ہیں آج ابوالوقت اور قطبِ زماں
یہی ہیں شیخِ شیوخ اور زبدۂ احرار
ملا جو گانٹھ کا پورا کوئی ارادتمند
تو نقدِ وقت ہیں شغل و وظیفہ و اذکار
کبھی جو خواب پریشاں میں وہ لگے اُڑنے
تو اپنے زعم میں ہیں مثلِ جعفرِ طیّار
کبھی جو عالَمِ رویا میں دیکھ لی بیری
مقامِ سدرہ کو طے کر چکے۔ زہے پندار!!
بنائیں پہلے تو شیطاں کی جھونپڑی دل میں
کریں خیال کا لَو لگا کے پھر فی النّار

اگر ہیں شرع پہ قائم تو ہیں جنیدِ زماں
جو بنگ نوش ہے کوئی تو ہے قلندر وار
رجوعِ خلق کی خاطر ہوئے ہیں گوشہ گزیں
کہ جیسے جھیل پہ بیٹھے سکڑ کے بوتیمار
بنے جو شیخ تو پھر وجد و حال بھی ہے ضرور
دکھائیں رقص جمل وہ ۔ کہ دنگ ہوں حضّار
یہ ناز ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا ہیں
اگرچہ ننگِ بزرگاں ہوں آپ کے اطوار

عوام

عوام کی ہے یہ صورت کہ بس خدا کی پناہ!
ہر ایک پیشۂ بے غیرتی میں کارگزار
ہر ایک لہو میں شامل ہر اک لعب میں شریک
کہیں کا سانگ تماشا کسی کا ہو تہوار
دغا فریب ہو چوری ہو ۔ یا اُچکّا پن
نہیں ہے باک کسی کام سے انھیں زنہار
اب ان کے واسطے ہیں یہ مدارجِ اعلیٰ
پریس مین قلی ۔ کوچوان ۔ خدمت گار

انگریزی فیشن والے

رہا وہ جو گلہ۔ جسے چڑ گئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت! نہ انبیا درکار!!

وہ آنکھ میچ کے برخود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار

جو پوششوں میں ہے پوشش تو پس دریدہ کوٹ
سواریوں میں سواری تو دُم کٹا رہوار

جو اردلی میں ہے کتّا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق۔ نے خدا ترسی
گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار

وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا رڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورتِ اغیار

نہ انڈین میں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش
نہ اُن کو چرچ میں آنے نہ مسجدوں میں بار

ہے استفادہ مکالی سے جن کو انشا میں
قلم کے زور سے بنتے ہیں قوم کے غم خوار
جو ہے بھی کوئی۔ تو لاکھوں میں ایک آدھ ایسا
کہ تیرِ درد ہوا ہے جگر میں جس کے دو سار
دگرنہ کس کو یہ غم ہے؟ کہ میری پیاری قوم
ہوا ہے زرد یہ کیوں تیرا چہرۂ گلنار
یہ تیرے پھول سے پنڈے پہ کیوں ہے میل کچیل؟
یہ تیرے چاند سے مکھڑے پہ کیوں ہے گرد و غبار؟
کدھر ہے تیری طبیعت؟ کہاں ہے تیرا دل؟
خموش کیوں ہیں؟ یہ تیرے لبِ شکر گفتار
اٹا ہے خاک سے کیوں؟ تیرا دامنِ دولت
چبھے ہیں کیوں ترے تلوے میں مفلسی کے خار؟
کہاں ہے وہ تری عزّت کا گوہرِ رخشاں ؟
کہاں ہے وہ تری حشمت کا خلعتِ زرتار
تری معاش کی کشتی ہوئی ہے طوفانی
نہ بادباں ہے۔ نہ لنگر۔ نہ ڈانڈ نے پتوار
ہوا ہے گلشنِ اخلاق جل کے خاکستر
چلی ہے کب سے یہ ایسی سمومِ آتشبار

بجائے سنبل و ریحاں کے اُٹھ رہا ہے دُھواں
بجائے پھول کے شعلہ عوض کلی کے شرار
یہ تیرے علم کا دارالجلال کیوں ہے خراب ؟
چھتوں پہ گھاس تو ٹوٹے ہوئے در و دیوار
ترے مرض کی یہاں تک پہنچ گئی نوبت
کہ تیرے حال پہ روتے ہیں یار اور اغیار
رسوم بد نے ترے ہاتھ پاؤں جکڑے ہیں
فضولیوں نے تیرا کر دیا ہے سینہ فگار
تری مڑک نے پنپنے دیا نہ تجھ کو حیف !!
تری اٹک سے تری ناؤ جا پڑی منجدھار
وہ اہل فضل کہ تھے افتخار ہندوستاں
اب اُن کی نسل کو دیکھو تو ہے وہ ٹھیٹ گنوار
وہ جن کے نام سے نامی تھے شہر اور قصبات
گداگری میں ہے مصروف اُن کا خیل و تبار
وہ دودمانِ امارت کے تھے جو چشم و چراغ
اب اُن کے ہاتھ میں ڈھولک ہے یا بغل میں ستار
جو منتخب تھے نجابت میں اور شرافت میں

اب اُن کی آل کو دیکھو تو سخت بدکردار
یہ ہانکتے ہیں جو گاڑی کسی مہاجن کی
انھیں کے مورثِ اعلیٰ تھے صوبہ دارِ بہار
ہے آج ٹکڑے کو محتاج اُن کی ذُرّیت
کہ جن کی دھاک تھی سلہٹ سے لیکے تا قندھار
امارت اپنی امیروں نے قرض میں کھو دی
عوض میں دس کے دئے ننو تو سنو کے ایک ہزار
بہت سے بن گئے عیاش ہو گئے برباد
بہت سے بن گئے اوباش کھیلتے ہیں قمار
قمار میں بھی نہ سیدھا پڑے کبھی پانسہ
یہاں بھی خوبیِ قسمت سے جائیں بازی ہار
میں کیا کہوں کہ وہ بھرتے ہیں کس کی جلیبیں آج
یہ کل جو پھرتے تھے چھیلا بنے سرِ بازار
وہ آج کرتے ہیں فاقے جو تھے بڑے ملکی
نہ گھر میں گیہوں کے دانے نہ باجرا نہ جوار
ہے ٹھیکرا وہی روٹی کا پیرزادوں کی
جو گانوں ہے کوئی باقی بطورِ وقفِ مزار

ہوئی تمام بتدریج منتقل جاگیر
کہ جیسے روم کے قبضہ سے صوبۂ بلغار
نہ کوئی علم نہ صنعت۔ نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پر سوار ہے ادبار
اگرچہ نشو ونما پا رہی ہے آزادی
کھلا ہے امن وحفاظت کا قیصری دربار
اگرچہ ملک میں علم و ہنر کا ہے چرچا
حصول عزّت و دولت کا گرم ہے بازار
ہر ایک قوم میں گھوڑ دوڑ ہے ترقی کی
درست ساز ویراق اور وردیاں تیّار
لگا کے شوق کا ہنٹر۔ اُمنگ کی مہمیز
سمندِ جہد کو سرپٹ اُڑا رہے ہیں سوار
ہے ان کا رخش طلب دوڑ دھوپ میں آندھی
بہت فراخ ہے میداں۔ زمین ہے ہموار
اور ان کے ناقۂ ہمت کی ہیں ڈگیں لمبی
اب ان کو طے مراحل نہیں ہے کچھ دشوار
پلٹ گیا ہے زمانہ بدل گئی ہے رُت

نمو کا وقت ہے اور ابتدائے فصل بہار
نہیں بعید کہ ہو جائیں ایک سب جل تھل
برس رہا ہے ترقی کا ابر گوہر بار
ہر ایک زاغ نے سیکھا ترانۂ بلبل
بھبیریوں نے اُڑائی نوائے موسیقار
غرض کہ سب ہیں صلاح و فلاح کے جویا
دیا ہے ولولۂ شوق نے دلوں کو اُبھار
زمانہ چونک پڑا ہے پر اے مسلمانو!
جھنجوڑنے سے بھی ہوتے نہیں ہو تم بیدار
نہیں ہو فہم و درایت میں تم کسی سے کم
مگرچہ کارکند شیر شرزہ در بنِ غار
اور ایسا غار کہ بالکل جہاں اندھیرا گُپ
پھر اس میں شیر مرے یا جئے بدونِ شکار
کروں گا اب میں قصیدہ کو اک دعا پر ختم
کہ جس کے طرزِ بیاں میں ہوں تازہ نقش و نگار

دعا

رہے زمانہ میں جب تک زمین کو گردش

بنائیں زاویہ تا محور اور سطحِ مدار
رہے زمین پہ تا ایک سال کے اندر
برابری میں سدا امتدادِ لیل و نہار
رہے زمین میں تا قوتِ کشش باقی
اور اس کشش سے گریں ٹوٹ ٹوٹ کر اثمار
یہ ایک چاند رہے تا زمین کا خادم
جلو میں تا زحل و مشتری کے ہوں اقمار
رہے نجوم میں جب تک زمین سیّارہ
اور آفتاب رہے مثلِ نقطۂ پرکار
خدا ہر ایک مسلمان کو کرے روزی
معاشِ نیک و دلِ پاک و خوبیٔ کردار
حصولِ علم و رہِ مستقیم و فہمِ سلیم
جمالِ صورت و معنی بکمالِ عزو وقار

(۱۰) تہنیت جشن جوبلی حضور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر ہند دام اقبالہا

ہے خداوندِ حقیقی کو سزاوار سپاس
جان نے تن میں کیا حکم ہے جس کے اجلاس
پارلیمنٹ کھلی کشورِ دل کے اندر
عقل نے تخت کی اسپیچ پڑھی پیشِ حواس
ایسے دربارِ مقدس میں اُسے بار ملا
جس کا دانش کی لونڈر سے معطر تھا لباس

تہنیت نامہ سنانے کو بتعظیم و ادب
حاضرِ بزم ہوئے ذہن و ذکا فکر و قیاس

مالک الملک ہے تو اور عزیز و جبّار
تو ہی خلّاق ہے رزّاق ہے اور ربّ النّاس

صحنِ عالم میں کیا خیمۂ اطلس برپا
جس میں قدرت کے جڑے گوہر و لعل و الماس

دشت و کہسار کو دی سبزۂ و گل سے زینت
سامنے جن کے لگیں لعل و زمرّد بھی اُداس

شاخِ اشجار میں لٹکائے ثمر رنگا رنگ
جس میں حکمت نے کیا جمع مٹھاس اور کھٹاس

تاکہ دامانِ زمیں تازہ و شاداب رہے
تو نے رکھا کمرِ کوہ پہ چشموں کا نکاس

تو نہ مٹی سے اُگاتا جو چنے اور گیہوں
خاک سے کرتا مہیّا جو نہ سن اور کپاس

کون کرسکتا یہ پُر ذائقہ کھانے طیّار
کون بُن سکتا یہ پُر زیب ردا اور لباس

تیری رحمت کے طلبگار ہیں سب شاہ و گدا
تیری حکمت نے ہر اُس کو دیا اس کو پلاس

تیری قدرت سے قوی حکم ہے تیرا ناطق
ہے بھلا نقدِ بقا تیرے سوا کس کے پاس

آج اورنگِ سلیماں ہے نہ تختِ بلقیس
کشتیِ نوح کا تختہ نہ گلیمِ الیاس

ذکرِ خیر اُن کا زبانوں پہ رہے گا جاری
ہاں مگر عزّت و دولت کا یہی ہے مقیاس

بہرہ ور تاجوری سے وہی ذی ہوش ہوا
تیری خلقت کا کیا جس نے دل و جاں سے پاس

نیک نامی کی نہ پائی کبھی اُس نے خوشبو
چڑھ گیا مغز میں جس شاہ کے غفلت کا ہڑاس

سُن کے اس نامۂ پُر مغز کا مین نے مضمون
اور بھی اس کے تتمّہ میں لکھے شعر پچاس

ہند پر قیصرِ عادل کو تسلّط بخشا
کس زباں سے ہو تری حمد و ثنا شکر و سپاس

ملک کو تو نے نئے سر سے کیا پھر سرسبز
تیری رحمت سے نہ ہو غمزدہ کوئی بے آس

دور از یں حال تباہی کی گھٹا چھائی تھی
سیل کی طرح سے طغیان پہ تھے خوف و ہراس

بن گیا تھا چمنستان سے چٹیل میدان
بیل بوٹے تھے نہ پھل پھول نہ ہریالی نہ گھاس

شاہ گلشن تھے مغیلاں تو ولیعہد تھے خار
لالۂ و سوسن و نسریں کو ملا تھا بن باس

باغ شاہنشہی ہند میں آئی تھی خزاں
چیل کوّے تھے مگن بلبل و طوطی تھے اداس

آلِ تیمور کے خورشید کا تھا وقت غروب
شام ادبار کی ظلمت سے دلوں میں تھی یاس

ضعف پیری سے حکومت کا لبوں پر دم تھا
نہ تواں و سان ٹھکانے تھے۔ نہ قائم تھے حواس

تھے جدا سلطنتِ ہند کے ریزے ریزے
جیسے چینٹوں کی جماعت میں ہو تقسیم مٹھاس

مرزبانوں کے سروں پر تھا کوئی سر تاج
جان اور مال کا تھا حفظ نہ ناموس کا پاس

مغربی گھاٹ سے اٹھتے تھے جو موجے پیہم
دامنِ کوہ ہمالہ سے وہ کرتے تھے تماس

غوری و خلجی و تغلق کے مٹے تھے دستور
شیر شاہی کی روش تھی نہ حصار رہتاس

نام تھا نظم و نسق کا نہ سیاست کا نشاں
اکبری دور کی باقی نہ رہی تھی بو باس

جاٹ گردی تھی کبھی۔ گاہ مرہٹہ گردی
کبھی پنڈاروں کا تھا ڈر کبھی سکھوں سے ہراس

پرتگیز اور ولندیز و فرانسیس بھی تھے
ملک گیری کی جنھیں بھوک تھی اور مال کی پیاس

جب کلایو نے پڑھی سیف و قلم کی سیفی
کچھ گھٹے ہند کے دل سے خفقان و وسواس

فرش دولت کی لگی ہونے نئی قطع و برید
چھٹ چلا جنگ پلاسی سے وہ پامرینہ پلاس

ہیسٹنگز اور ولزلی نے عجب کام کئے
نبضِ دولت کے یہی لوگ تھے رفتار شناس

چارہ فرما ہوئے ڈلہوزی و ولیم بینٹنگ
آگئی طبعِ ممالک کو دوا اُن کی راس

ہند میں کوکبِ انگلش نے کیا خوب عروج! جس کے مشرق تھے یہ کلکتہ و بمبی - مدراس
واں پڑا سایۂ پرچم کہ جہاں بہتے تھے ستلج و راوی و چناب - اٹک اور بیاس
اِس صدی کے گئے جس وقت کہ سینتس برس فورتھ ولیم کی ہوئی ختم شمارِ انفاس
ہر مجسٹی دی کوئن وارث تاج و دیہیم تخت برٹش پہ ہوئی زیب فزائے اجلاس
کمپنی ہند کی ملّاح رہی مدت تک لائی پھر غدر کا طوفان ہوائے وسواس
غدر کے بعد ہوا دورۂ شاہی آغاز نیّرِ دولت و اقبال چڑھا سمت الراس
پھر نئے سر سے ہوا کاخِ حکومت ترمیم قیصری قصر کی ہونے لگی مضبوط اساس
اے ترے تاج میں انصاف و عدالت گوہر اے ترے تخت میں احسان و محبت الماس
عفو تقصیر کا جاری کیا تو نے منشور بن گئے جان تنِ ہند کو تیرے انفاس
تیری دولت کے مدبّر تھے فلاطونِ زمن کھو دیا سب جگرِ ملک سے درد و آماس
کھل گیا سطح حکومت کا نشیب اور فراز حسنِ تدبیر کی جس وقت لگائی کپاس
کردیا ہند کے اجزائے پریشاں کو بہم جُڑ گیا ٹوٹ کے پھر نظم و سیاست کا گلاس
امن و انصاف کا پڑھنے لگے سب مل کے سبق حاضرِ اسکولِ اطاعت میں ہوئی جملہ کلاس
سندھ ہے ایک طرف دوسری جانب برہما قاعدہ کوہِ ہمالہ تو بکاری ہے راس
کس دیا ملک کو قانون کی زنجیروں میں تا شرارت پہ ابھارے نہ کسی کو خنّاس
عہدِ دولت سے ترے پائی دلوں نے تسکیں سکّۂ زر کی طرح چل گیا تیرا قرطاس
ہیں ہنر تیرے زمانہ کے بغایت روشن روغن و موم کی جا جلنے لگی برق و گاس

تار کے سامنے یکساں ہے نہ کچھ دیر نہ جلد | ریل کے آگے برابر ہے نہ کچھ دور نہ پاس
گاؤں در گاؤں ہوئیں علم کی نہریں جاری | اوکھ سے پینے لگے جن کو لگی زور کی پیاس
فیضِ تعلیم سے عالم ہوئے جاہل ہندی | کوئی عالم کوئی منشی تو کوئی حرف شناس
دم بدم ابرِ ترقی ہوا گوہر افشاں | کوئی ایف اے کوئی بی اے کوئی ایم اے ہی پاس
دورِ شاہی نے ترے اُن کو بنایا انساں | جن میں کھانے کا سلیقہ تھا نہ تمیزِ لباس
آدمیت کا پڑا اُن کے دلوں پر سایہ | بعض قومیں کہ جو خصلت میں تھیں غول نسناس
اکثر اضلاع میں کھلتی ہیں نمائش گاہیں | جمع ہوتی ہیں جہاں ملک کی صنعی اجناس
گائے بکری کی نہ ہوتی تھی جہاں پر بکری | اب وہاں تازی و ترکی کے ہیں لگتے نخاس
بحر و بر میں ہے ترے زیرِ نگیں جتنا ملک | شاید اس وقت نہیں اور کسی شاہ کے پاس
بحرِ اعظم میں مہابت ہے ترے بیڑے کی | برِّ اعظم میں تری فوج سے دشمن کو ہراس
مملکت میں تری چھپتا نہیں سورج زنہار | ہے یہ جغرافیہ کی رو سے بہت ٹھیک قیاس
جشنِ جوبلی کا ہوا غلغلہ برپا گھر گھر | خیر سے تخت نشینی کو ہوئے سال پچاس ۵۰
تیری دولت کی دعا یوں ہے دلوں سے جاری | جیسے گنگوتری کے چشمے سے گنگا کا نکاس

فضل سے اپنے کرے تجھ کو عطا عمرِ دراز
جس کی قدرت کی کچہری میں مہ و خور چپراس



(۱۱) جاڑہ اور گرمی[۱]

ایک دن جاڑے نے گرمی سے کہا
میں بھی ہوں کیا خوب موسم واہ وا!
ہے بجا گر کیجئے میری صفت
ہے روا گر کیجئے میری ثنا
میں جہاں میں ہوں زبس ہر دل عزیز
مانگتے ہیں میرے آنے کی دعا
میرے آنے سے نہ ہو کیوں خرّمی
کیا خنک پانی ہے! کیا ٹھنڈی ہوا!
چاندنی ہے بے کدورت بے غُبار
آسماں ہے صاف نیلا خوشنما
رات گرمی کی تو کچھ ہوتی نہ تھی
دن کی محنت سب کو دیتی تھی تھکا
میری آمد نے کیا شب کو دراز
میرے آنے نے دیا دِن کو گھٹا
لُو مسافر کا جُھلس دیتی تھی مُنہ
اور زمیں تلووں کو دیتی تھی جَلا
اب ہوا بھی اور زمیں بھی سرد ہے
کھو دیا میں نے حرارت کا پتا
مل گئی کِتنے بکھیڑوں سے نجات
ٹٹیاں موقوف پنکھا چُھٹ گیا
دھوپ کا ڈر ہے نہ لُو کا خوف ہے
ان دِنوں کی دھوپ ہے گویا غذا
سورج اب کترا کے جاتا ہے نِکل
فصلِ تابستاں میں تھا سر پر چڑھا
ہے حضر میں آج کل عیش و نشاط
ہے سفر بھی اِن دِنوں راحت فزا
میرے دم سے تندرستی بڑھ گئی
پائی مدّت کے مریضوں نے شفا
ڈاکٹر صاحب کو فرصت مل گئی
اب شفاخانہ میں کم ہے جمگھٹا

[۱] مرتبہ ۱۸۸۶ء

ضعفِ معدے کی شکایت مٹ گئی — بے دوا خود بڑھ گئی ہے اشتہا
مکھیاں بھی رہ گئی ہیں خال خال — بے تکلّف اب ہے کھانے کا مزہ
گرم پوشاکوں نے اب پایا رواج — ہیں نے بخشا آن کر خلعت نیا
سِل گئے پوشاک لبادے اور لحاف — درزیوں نے پایا محنت کا صلہ
میوے ہوتے کون پوچھے برف کو — باسی پانی برف کا بھی ہے بچا
ندی نالوں کا گیا پانی نِکھر — جھیل اور تالاب نے پائی صفا
طالبِ علم اب کریں گے کوششیں — کوششوں سے ہوگا پورا مدّعا
ٹھیک وقت اُن ورزشوں کا ہے یہی — تندرستی کا ہے جن سے فائدہ
کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک — کرتے ہیں مضبوط جسمانی قُوا
حاکموں نے کر دیا دورہ شروع — تا کریں دردِ رعایا کی دوا
جابجا فوجیں ہوئی ہیں مجتمع — تاکہ میداں میں کریں مشقِ وغا
سیب - نارنگی - بہی - لیمو - انار — ذائقہ ہے جن کی صورت پہ فدا
پستہ و بادام انگور و مویز — میوہ ہر اک قسم کا بکنے لگا
تخم ریزی جنسِ اعلیٰ کی ہوئی — کھیت میں بویا گیا گیہوں چنا
عید کی سی دھوم ہے دیہات میں — پک گئی ایکھ اور کولھو چل پڑا
ہے مٹھائی کی نہایت ریل پیل — چل رہی ہے آج کل میٹھی ہوا
اُنس ہے محنت مشقّت سے مجھے — کاہلی کو میں نہیں رکھتا روا

محنتی ہیں مجھ سے خوش ہیں اُن سے خوش
کاہلوں کا میں نہیں ہوں آشنا

سن کے یہ باتیں ہوئی گرمی بھی تیز
اور جل کر یوں جواب اُس کو دیا

آپ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بن
خودستائی عیب ہے او خودستا

اُس کو ہوتا ہی نہیں حاصل کمال
جو کہ اپنے آپ کو سمجھے بڑا

باہنر تو سرکشی کرتے نہیں
بلکہ سر کو اور دیتے ہیں جھکا

تیری خودبینی ہوئی تجھ کو حجاب
خوبیوں کو میری سمجھا بدنما

تجھ سے عالم میں خزاں کا ہے ظہور
مجھ سے ہے فصلِ بہاری کی بنا

تو نے شاخوں کے لیے پتّے کھسوٹ
تو نے پیڑوں کو برہنہ کر دیا

میرے آنے سے پھلے پھولے شجر
سبز پوشاک اُن کو میں نے کی عطا

میں نے شاخوں میں لگائے برگ و بار
ورنہ تھا کیا اُن میں ایندھن کے سوا!

کھیت جاڑے بھر تو کچّے ہی رہے
ہاں مگر میں نے دیا اُن کو پکا

تو نے رکھّے تھے بخیلوں کی طرح
برف کے تودے پہاڑوں میں چھپا

میں نے پگھلا کر کیا تقسیم اُسے
تاکہ پہنچے سب کو فیض و فائدہ

خشک چشمے بھر گئے دریا چڑھے
دیکھ لے میرا کرم۔ میری سخا

تجھ سے تھی مخلوق میں افسردگی
کون خوش تھا؟ جز گروہِ اغنیا

میری آمد نے مساوی کر دیے
راحت و آرام میں شاہ و گدا

کر دیا میں نے رگوں میں خوں رواں
ٹھنڈ سے شل ہو گئے تھے دست و پا

میں نے کھولے آن کر تن کے مسام
کیونکہ تھا رکنا پسینہ کا بُرا

پھینک دی اب دلق کہنہ خلق نے
غلغلہ جو میری آمد کا سُنا

رات بھر رہتی تھی خلقت گھر میں بند
کر دیا اُس بند سے میں نے رہا

مارے پھرتی تھیں بطیں پردیس میں
میں ہوئی اُن کو وطن کی رہنما

لُو اُٹھا کر لے چلے غلہ کسان
اب کریں گے قرض بنیوں کا ادا

میں نے حکمت سے چلائیں آندھیاں
تا بدل جائے مکانوں کی ہوا

میں سمندر سے اُٹھاتی ہوں بخار
جس سے چھا جاتی ہے ملکوں پر گھٹا

چہرۂ گردوں کا یہ گرد و غبار
ابر کے آنے کا دیتا ہے پتا

رات پر دن کو نہ کیوں ترجیح دوں
رات ہے تاریک دن ہے پُرضیا

ہے ہمیشہ ابتدا میری بہار
ہے سدا برسات میری انتہا

تھیں غرض دونوں کی تقریریں دراز
اور طولانی بیانِ ماجرا

سن کے اِن دونوں کی یہ کج بحثیاں
ایک دانا نے کیا یوں فیصلہ

کچھ نہیں ہے اِس میں جاڑے کا قصور
کچھ نہیں ہے اِس میں گرمی کی خطا

جب حقیقت پر نہیں ہوتی نظر
یوں ہی رہتا ہے بہم شکوہ گلا

ہے حرارت کی کمی بیشی فقط
ورنہ جاڑا کون؟ اور گرمی ہے کیا؟

(۱۲) قصیدہ تہنیت سالگرہ حضور ملکہ معظّمہ قیصر ہند دام اقبالہا

ذاتِ خداوند ہے قابلِ حمد و ثنا
جس کی حمایت میں ہیں شاہ سے لے تا گدا

امنِ جہاں کے لئے اُس نے بنائے ملوک
عالمِ اسباب میں تھی یہی صورت بجا

خدمتِ فرماں دہی طاعتِ حق ہے مگر
تھوڑے ہی نکلیں گے جو کرتے ہیں خدمت ادا

ایسے بھی ہیں تاج دار جن میں نہیں عدل و رحم
دیتے ہیں بے بات بھی خون کے دریا بہا

ایسی حکومت مگر جسم پہ محدود ہے
قبضہ میں اُس کے نہیں کچھ سر و تن کے سوا

توپ گرجتی ہوئی تیغ چمکتی ہوئی
لازمۂ سلطنت سمجھی گئی ہے سدا

مملکتِ دل میں ہاں جس کا ہے سکّہ رواں
اُس کی روش اور ہے اُس کا چلن ہے جدا

عدل وہاں توپ ہے اور کرم تیغ ہے

شکرِ شاہنشہی مہر ہے واں اور ولا
جانتے ہیں ہم سبھی۔ کون ہے ایسا سخی
قیصرِ ہندوستاں حضرتِ وکٹوریا
ایسے شہنشاہ کا سایہ ہو جس ملک پر
اُس کے مبارک نصیب۔ ہے وہی عشرت سرا
اپنی رعایا پہ یوں فیض ہے اُس کا محیط
جوں کرۂ ارض کے چار طرف ہے ہوا
اپنی رعایا اُسے ہے دل و جاں سے عزیز
اُس کی رعایا اُسے دیتی ہے دل سے دعا
ہم نہیں خسرو پرست ہم نہیں اہلِ غرض
مدحِ شہنشاہ سے قصد ہے شکرِ خدا

(۱۳۱) قصیدہ ناتمام

تا کوئی فرخندہ پے دھوئے قدم
ہیں اسی دُھن میں رواں گنگ و جمن
تا کرے گلگشت کوئی خوش نظر
منتظر ہے رونقِ باغ و چمن
تا معطّر ہو کوئی عالی دماغ
دوڑتی ہے نکہتِ مشکِ ختن
چاہتی ہے لذّتِ قند و نبات
ہو کوئی طوطی منش شکّر شکن

تا کسی نازک گلے کا ہار ہو
قعرِ دریا سے چلا دُرِّ عدن

گر تصوّر میں نہ ہو اک جامہ زیب
کب کرے تیار کاریگر چکن

مل گئی گنگا میں گنگا بن گئی

جب الٰہ آباد میں پہونچی جمن

قطعات

(۱) ارل آف میو وایسرائے و گورنر جنرل ہندوستان

کیسی اُڑی ہے سمت جزائر سے یہ خبر
کیا ہو گیا کہ صرصرِ غم ہے ہوائے ہند

بیٹھے بٹھائے اس خبرِ ہولناک نے
ڈالا وہ زلزلہ کہ ہلا دی بنائے ہند

کس آفتِ عظیم نے یارب کیا نزول
ہوتا نہیں بیانِ غمِ ماجرائے ہند

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیوں آگیا پسند
نوابِ ہند و حاکمِ کشور کشائے ہند

افسوس اس کا حلقۂ ماتم میں ہے بیاں
تھا بزمِ عیش فر سے جس کے فضائے ہند

وہ نام آج باعثِ ماتم ہے اے دریغ
جس کا لقب تھا نائبِ ویسرائے ہند

کس کو کیا ہے خنجرِ بیداد نے ہلاک
وہ حاکمِ مدبّر و فرماں روائے ہند

کہتے ہیں لوگ آج قتیلِ ستم اُسے
کہتے تھے جس کو مالکِ تیغ و لوائے ہند

کیا جاں گزا ہے قتلِ گورنر کا واقعہ
ماتمکدہ ہی چاہئے لکھنا بجائے ہند

واحسرتا کہ قافلہ سالار چل دیا
بے رونق و خراب ہے مہماں سرائے ہند

رُکنِ رکینِ سلطنتِ ہند اُٹھ گیا — دستِ اجل نے توڑ دیا حیف پائے ہند
کیا انقلابِ دورِ زماں ہے کہ ہو گیا — ہندوستاں برائے غم و غم برائے ہند
اس حادثہ سے ہے جگرِ خلق پاش پاش — کیوں کر رفو پذیر ہو چاکِ قبائے ہند
کیا نحس وہ جزیرۂ دریائے شور ہے — جس کے سبب سے اشکِ مصیبت بہائے ہند
اے کاش جانتے کہ یہ ہے آخری وداع — رخصت ہوئے تھے ہند سے جب وائسرائے ہند

ہاتف نے دی ندا کفِ افسوس مل کے یوں
بس دل شکن ہے آہ غمِ وائسرائے ہند
۱۲۸۹ھ

(۲) شب برات [1]

محمود شب برات کا سامان ہے یہی — اخبار پھلجھڑی تو پٹاخا پیام تار
ہیں عالمِ خیال میں ہم بھی وہیں کھڑے — ترکانِ شیر دل ہیں جہاں گرمِ کارزار
بلگیریا میں ہم کبھی آئے گئے نہیں — نظروں میں ہیں مگر وہی میدان و کوہسار
پھرتا جہاں رسالۂ کاسک ہے دوڑتا — اور ان کی تاک جھانک میں سرکیشن سوار
ہم وارنہ میں دیکھتے ہیں وہ ہجومِ فوج — تھا جس کے روم و مصر سے آنے کا انتظار
اڑتا ہوا نشانِ ہلالی نظر پڑا — پہنچا جو شوملہ پہ تصور رکا رہوار
گویا کہ دیکھ بھال کے ہم آئے ہیں ابھی — میدان اور مورچے اور خیموں کی قطار
رسچق سے آ رہی ہے دنادن کی اک صدا — اور سستوا کو لوٹ رہے ہیں ستم شعار

[1] مرتبہ ۱۸۷۷ء

بھاگا ہے ترنوا کو نکولاس چھوڑ کر
آتا ہے بے دھڑک جو سلیمانِ ذی وقار

آئی پلیونہ سے نویدِ ظفر ہمیں
عثمان نے کیا ہے وہاں روس کا شکار

(۳۳) شبِ براتؔ[1]

اے شبِ برات عمر ہے تیری بہت بڑی
ہیں سن و سال تیرے کہاں تک کروں شمار

ہے ہجرتِ رسول کو یہ تیرھویں صدی
اور تو ہر ایک سال میں آتی ہے ایک بار

دیکھا ہے تو نے آنکھ سے اسلام کا عروج
تجھ کو تو خوب یاد ہے تاریخِ روزگار

کرتا ہوں اک سوال مجھے تو جواب دے
پہلے بھی تھا یہ فرقۂ اسلام کا شعار؟

کیا امتِ نبی کی یہی رسم و راہ تھی؟
جو فی زمانناً ہے مروّج بہر دیار

بول اُٹھ جو تو نے دیکھی ہو اگلے زمانہ میں
حلوے کی چاٹ اور اناروں کی یہ بہار

ہے فرضِ عین آج پٹاخوں کا چھوڑنا
یہ مشغلہ نہ ہووے تو بچے ہیں بے قرار

حلوا نہ کھائے جو وہ مسلمان ہی نہیں
چھوڑے نہ جو انار وہ کا ہے کا دیندار

سامان کوئی گھر میں میسر اگر نہ ہو
حلوائی اور بنئے سے لے آتے ہیں اُدھار

بھجوائیں دے کے فاتحہ مُردوں کے واسطے
اسلام کا ہے اب تو اسی رسم پر مدار

بولی شبِ برات کہ میں کیا جواب دوں
لوگوں کے سر پہ جب سے جہالت ہوئی سوار

اسلام کے طریق سے بس ہو کے منحرف
کر بیٹھے ہیں مراسمِ بیہودہ اختیار

[1] مرتبہ ۱۸۸۳ء

یہ قوم آج اہلِ جہاں کی نگاہ میں　　بد رسمیوں سے آپ ہے اپنی ذلیل و خوار

اسلام میں پتا بھی نہیں جن رسوم کا
اصلِ اصولِ دیں انھیں کرنے لگے شمار

(۴) تاریخِ وفاتِ سر سالار جنگ بہادر مرحوم

وہ دکن کا مُدبّرِ یکتا　　رُکنِ دولت وزیرِ نیک خصال
مُلک رانی میں وہ یگانۂ عصر　　کاردانی میں بے نظیر و ہمال
اہلِ کشور کا وہ محبِّ دلی　　اور نظامِ دکن کا خیر سگال
یعنی سالار جنگِ نام آور　　جو کہ مختارِ ملک تھا فی الحال
قوم کا ملک کا وطن کا دوست　　کاملِ و قدردانِ اہلِ کمال
سلطنت کے رموز کا اُستاد　　مملکت کے عُقود کا حلّال
اُس کے عدل و کرم سے خلقت شاد　　اُس کے نظم و نسق سے ملک نِہال
عام کو چین خاص کو آرام　　سلطنت کا خزانہ مالا مال
نہ ہوا اُس کے عہد میں زنہار　　مفسدوں کے سوا کسی کو زوال
اُمرا اُس کے دور میں خوش وقت　　غُربا اُس کے وقت میں خوشحال
نیک دل نیک خوی و نیک نہاد　　صاحبِ جود و لطف و بذل و نوال
اُس سے منسوب عزم اور ہمّت　　اُس سے مخصوص شوکت و اجلال

خرد اُس کی محاسبِ انجام — نظر اُس کی دقیقہ سنجِ مآل
اُس کی رائے متین نے بخشا — امن اور عافیت کو استقلال
اُس کی عقلِ سلیم نے بخشا — شاہدِ مملکت کو حسن و جمال
چل بسا وہ وزیرِ با تدبیر — اُٹھ گیا وہ امیرِ با اقبال
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ — اے بسا مدعا کہ شد پامال
شرق سے تا ممالکِ مغرب — لے کے دکّھن سے تا حدودِ شمال
ہند سے تا بملکِ انگلستان — اُس کے ماتم میں ہیں پریشاں حال
تو بھی محمود لکھ کوئی تاریخ — جس سے ظاہر وفات کا ہو سال

آہ روشن قیاس و دانشور
آہ دانش ور و بلند خیال

۱۳۰۰ھ

(۵) عید الفطر[1]

تیس دن بھوک پیاس کو روکو — یہ ریاضت ہے آدمی کو مفید
روزہ کیا چیز ہے بتائیں تمھیں — حرص کی قید نفس کی تہدید
سب کو بھولو کرو خدا کو یاد — سب کو چھوڑو بجز خدائے وحید
دو جہاں میں اُسی کا جلوہ ہے — ہے وہی مثلِ آفتاب پدید
دل کی آنکھوں سے دیکھیے لیکن — کہ خدا را بچشم نتواں دید

[1] مرتبہ ۱۸۸۳ء

وحدہ لا الٰہ الّا ہو
کچھ نہیں ہے سوائے ربِّ مجید

تا بمقدور کیجئے تہلیل
تا با مکان چاہیئے تمجید

معتکِف خانۂ خدا میں بنو
کچھ تو سیکھو طریقۂ تجرید

عید کرتے ہیں اس وتیرہ پر
جو خدا کے ہیں بندگانِ رشید

رمضاں کا مہینہ یوں گزرا
ختم روزے ہوئے تو آئی عید

عید کے دن پڑھو نماز و دعا
عذرِ تقصیر کی کرو تمہید

کہ خدایا نہ ہو سکی طاعت
نہ ہوا ہم سے کوئی کارِ سعید

نہ ہوئی تیرے حکم کی تعمیل
نہ ہوئی اہلِ رُشد کی تقلید

کوئی خدمت بجا نہ لائے ہم
جنسِ عقبیٰ کی کر سکے نہ خرید

جو ہوا تیری مہربانی سے
ناتوانوں کی تو نے کی تائید

شکر کی تو نے ہم کو دی توفیق
شکر سے تیری نعمتیں ہیں مزید

شکرِ نعمت بھی تو نے سکھلایا
ورنہ تھا ہم سے تو بہت ہی بعید

جا کے حاسد سے یہ کہو محمود
اب کے عیدی لکھی گئی ہے جدید

(۶) عید الضحیٰ[1]

عیدِ قرباں یادگارِ دینِ ابراہیم ہے
کیا خوشی کا دن ہے یہ بھی ربِّ کعبہ کی قسم

[1] مرتبہ ۱۸۸۷ء

شوق میں اطرافِ عالم سے چلی آتی ہے خلق
رو بسوئے کعبہ۔ دل مُشتاقِ آثارِ حرم

ساکنانِ رُبعِ مسکوں جمع ہیں مکّہ میں آج
روسی و جاوی و ہندی ترکی و مصری بہم

مختلف سب کی زبانیں اور جدا شکل و لباس
پر طوافِ کعبہ میں سب ہم خیال و ہم قدم

سرزمینِ مکّہ تھی ویرانۂ بے برگ و بار
قدرتِ حق نے مگر بخشا اُسے جاہ و حشم

کاروانِ بحر و بر اُس کی طرف ہیں دوڑتے
مرکزِ عالم ہے الحق وہ مقامِ محترم

نسلِ انسانی بہم ہوتی ہے اِس جا روشناس
ہے یہ میداں انتخابِ کاملانِ ذی ہمم

آپ کی عیدی ہے حامد یا کوئی تاریخ ہے
ایسی عجلت میں بھلا ہوتے ہیں یہ مضموں رقم

(۷) عید الضحیٰ[1]

عازمانِ طوافِ بیت اللہ
ساکنانِ نواحِ دور و دراز

کارواں کارواں روانہ ہوئے
شوقِ حج میں کیا سفر آغاز

ناخدا نے اُٹھا دیا لنگر
لے کے نامِ خدائے بندہ نواز

کر چکے طے محیطِ اعظم کو
جا لگے ساحلِ عرب پہ جہاز

سارباں نے بٹھا دیا ناقہ
ہو گئے داخلِ حدودِ حجاز

اشتیاقِ حریم میں سب نے
باندھا احرام تا کھُلے کچھ راز

پھرتے ہیں خانۂ خدا کے گرد
با خضوع و خشوع و عجز و نیاز

[1] مرتبہ ۱۳۰۳ء

کر کے نامِ خدا پہ قربانی — ہوئے قربان عاشقِ جانباز
کر کے غسل و وضو چلو محمود — عیدگہ کو پئے ادائے نماز
اب کے عیدی لکھی گئی کیسی
ہے نیا طرز اور نیا انداز

(۸) نذرانۂ پیرجیؒ[1]

جو کچھ نہیں بیکار ہے جو کچھ ہے سو بے سود — نیرنگِ دو عالم ہے تماشائے خیالی
اپنے ہی تخیّل سے ہیں یہ جملہ طلسمات — نے حق ہے نہ باطل ہے نہ سافل ہے نہ عالی
جب زور ہوا وہم کا سب ہو گئے پیدا — یہ نیک ہے یہ بد۔ یہ جلالی۔ یہ جمالی
ذکر و طلب و فکر و تمنّا ہیں سب اوہام — موجود نہ معدوم مقدّم ہے نہ تالی
یاں ہے نہ وہاں ہے نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے — ظاہر ہے نہ باطن ہے نہ حالی ہے نہ قالی
اقرار نہ انکار نہ کچھ علم نہ ادراک — ذاتی نہ صفاتی نہ حقیقی نہ خیالی
ہے روشنی سب ایک نہ تمییز نہ تفریق — گنتی میں ہزاروں ہیں چراغانِ دوالی
ہر چند مٹھائی کے بکثرت ہیں کھلونے — سب ایک ہیں جب ٹوٹ گئی شکلِ مثالی
ہر قسم کا نشا ہے وہی ایک حلاوت — گو مختلف اقسام سے معمور ہے تھالی
نے کشف و کرامت نہ مناصب نہ مراتب — جب کھل گئی آنکھیں تو نہ کھرا ہے نہ جالی
جو کچھ ہے کم و بیش اسے کیجئے منظور — جاتے ہیں کہیں پیرجی نذرانہ سے خالی

[1] پیرجی غلام محمد صاحب مرحوم وکیل ورئیس لودھیانہ مصنف کے برادرانِ طریقت میں سے تھے جن کے واسطے یہ نذرانہ ۱۸۸۳ء میں ترتیب دیا گیا۔

(۹) خوابِ راحت

کل رات کی بات ہے کہ مجھ کو — جھونکا سا غنودگی کا آیا
جھٹ پٹ تکیہ پہ رکھ دیا سر — دن بھر کا تھا میں تھکا تھکایا
کچھ آنکھ جھپک گئی تھی لیکن — اتنے میں کسی نے پھر جگایا
دیکھا تو ہوا کا سنسنانا — کچھ اور ہی رنگ روپ لایا
رہ رہ کے تڑپ رہی ہے بجلی — اور ابر ہے آسماں پہ چھایا
پڑنے لگیں بوندیاں ٹپاٹپ — سوتے لوگوں نے غل مچایا
ہلڑ جو مچا۔ اُچٹ گئی نیند — جوں دھوپ سے بھاگ جائے سایا
سب سو گئے جاگتا رہا میں — تب دل میں خیال یہ سمایا
خوابِ راحت بھی ہے عجب چیز — کیا عالمِ بے خودی ہے چھایا
اے نیند! نمونۂ قیامت — تو نے ہمیں آنکھ سے دکھایا
تو آئی ہوئے حواس بیکار — کیا جانئے تو نے کیا سونگھایا
جس وقت اُتر گئی گھٹا سی — آنکھوں کا چراغ ٹمٹمایا
پھر چھوڑ گئی ہمیں جہاں میں — پھر زیست کا ذائقہ چکھایا۔
پایا۔ تو کہیں تجھے نہ دیکھا — دیکھا تو کہیں تجھے نہ پایا
ہے تیری عجیب حکمرانی — دنیا کی پلٹ گئی ہے کایا

سلہ مرتبہ یکم اگست ۱۸۸۷ء

زن میں فوجوں کو جا پچھاڑا — بن میں شیروں کو جا دبایا
دہقان کو کھیت میں کیا چت — گو کھیت کو گیدڑوں نے کھایا
ریوڑ کی خبر نہیں کہاں ہے — چرواہے کو گھاس پر لٹایا
لینے کو درخت پر بسیرا — چڑیوں نے پروں میں سر چھپایا
ڈھوروں نے بھی چھوڑ دی جُگالی — چُپ ہیں نہیں کان تک ہلایا
جب چور کی آنکھ میں سمائی — اُس نے چوری سے جی چُرایا
رہزن کی بھی راہ باٹ ماری — رہگیر کو خوف سے بچایا
کھوئی ہوئی راہ رو کی منزل — پھیلا کے جو پاؤں سنسنایا
ماؤں کو دیا ہے تو نے آرام — بچوّں کو تھپک تھپک سُلایا
روتے روتے جھپک گئی آنکھ — جھُولے میں جھولا رہی ہے دایا
بیگم۔ ملکہ۔ غریب۔ بڑھیا — تیرا آنا سبھی کو بھایا
غم دُور ہوا ٹکڑ گدا کا — جھُولی ہے نہ جھونپڑی نہ سایا
بیڑی سے رُکا نہ ہتکڑی سے — محبوس کو قید سے چھُڑایا
شاہوں کی بھی کرّوفر مٹا دی — نے تاج۔ نہ تخت۔ نے رعایا
زرّیں پردے نہ فرشِ مخمل — ایوان ہے گُم سجا سجایا
جب سو گئے ہو گئے برابر — کب شاہ و گدا میں فرق پایا
جج کے بھی حواس ہیں معطل — فیصل ہوئے قصۂ و قضایا

ٹھنڈا ہوا تاجروں کا بازار — سودے کا معاملہ چکایا
ہے نقد کہاں؟ کدھر گئے نوٹ؟ — ساہوکاروں کو ٹھگ بنایا
لالہ کو نہیں رہی ذرا سدھ — کیا ڈیوڑھا۔ اور کیا سوایا
بنیوں کا الٹ دیا ہے پتّڑ — روکڑ ہے نہ جنس ہے نہ مایا
بیمار کی آنکھ لگ گئی ہے — دکھ درد کا کرب سب مٹایا
کچھ ہوش نہیں ہے ڈاکٹر کو — پلٹس لگے زخم پر کہ پھایا
اوسان نہیں حکیم جی کو — کیا نیند نے لخلخہ سنگھایا
تبرید پلایئے کہ مسہل — سب بھول گئے کیا کرایا
پنڈت بھی ہوئے نچنت ایسے — اشنان کئے۔ نہ جل چڑھایا
ملّا کو بھی ہوگیا ہے نسیاں — بھولا ہے مسائلِ ہدایا
تعریف نہ کرسکے مہندس — کیا شکل ہے قائم الزوایا
جغرافیہ داں کی راہ گم ہے — لنکا ہے کدھر کدھر ملایا
کچھ یاد نہیں مورّخوں کو — کیا کیا بہ روئے کار آیا
بھولا ہے کتاب طالبِ علم — الٹا تو نے سبق پڑھایا
مطرب کی عجیب گت بنائی — کھڑاگ جہان کا بھلایا
عابد۔ زاہد۔ فقیر۔ جوگی — صوفی کا بھی ہوگیا صفایا۔
چونکا نہیں قافلہ تری کا — ہر چند جہاز ڈگمگایا

پچھتے نہیں ریل کے مسافر | انجن نے ہزار غل مچایا
باقی نہ رہا کوئی تردد | جھگڑوں میں تھا جان کو کھپایا
سب مشغلے ہو گئے فراموش | اپنا ہی رہا نہ کچھ پرایا
دُنیا کی خبر نہ دین کا ہوش | کیا ساغرِ بےخودی پلایا

تو نے کیا نیند کو مسلّط

قدرت ہے بڑی تری خدایا

(۱۰) سید احمد خان

تنِ بے سر کی طرح قوم پڑی تھی بیجاں | سر جو پایا تو اُٹھی بہرِ قیام اور قعود
سرو ہی دسلمہ اللہ تعالےٰ سیّد | رہبری جس کو ہے بیراہ رووں کی مقصود
قومِ بدحال کے اندیشۂ غمخواری سے | کبھی خالی نہ رہا جس کا دلِ درد آمود
نہ گئی طالبِ صادق کی تگ و تازِ عبث | کُھل گیا قوم کی بہبود کا بابِ مسدود
ڈالی آخر کو دبستانِ خرد کی بنیاد | ہو گیا جلوہ نما وہ جو تھا ذہنی معہود
انقلاباتِ زماں سے ہو تحفظ کیونکر | تاگریز اُس کے لئے چاہئیں آئین و حدود
پس مرتّب ہوا مجموعۂ دستورِ عمل | تاکہ ہر عہد میں کام آئے پئے حلِّ عقود
کثرتِ رائے سے اب پاس ہوا وہ قانون | جس سے مقصود ہے کالج کا دوام اور خلود

۵ا مرتبہ ۱۸۹۰ء یہ قطعہ اس موقعہ پر لکھا گیا تھا جب کہ قانون ٹرسٹیان کی بابت باہم اختلاف تھا۔

قوم نے فرطِ مسرت سے سُنا یہ مژدہ — سیّد القوم کا ہمکار ہے سیّد محمود
ہوگیا دور تِن قوم کو تھا جو خطرہ — للہ الحمد - کہ ایک اور بھی سر ہے موجود
صد وسی سال رہے زندہ ابھی پیرِ بزرگ — نوح کی عمر کو پہنچے یہ جوانِ مسعود
دوربیں فہم و خرد کی ہمیں دکھلاتی ہے — قوم کا نیّرِ اقبال ہے مائل بصعود
خدمتِ قوم پہ آمادہ ہوا وہ مخدوم — نام کی طرح سے ہیں کام بھی جس کے محمود
کچھ مسلماں ہی نہیں صرف اُس کو بھلا جانتے ہیں — مانتے ہیں اُسے انگریز بھی - نیز اہلِ ہنود
حظِّ وافر ہے اُسے نو و کہن سے حاصل — ملتقی گنگ و جمن کا ہے مگر اُس کا وجود
اُس کے سینہ میں ہیں قدرت نے ودیعت رکھے — علم و حکمت کے گہر، فضل و بلاغت کے نقود
یہ سلیماں ہی کرے گا اُسے الحق کامل — جس عمارت کی بنا ڈال رہا ہے داؤد
ڈالدیں ورطۂ نسیاں میں اسے اب احباب — چھڑ گئی تھی وہ جو اک بحث بہم رنج آلود
صلح کے ساتھ اگر - ذکر کریں بھی تو کریں — نہ کہ آپس میں لڑیں مثل نصاریٰ و یہود
اتفاقات سے گر ہو بھی گیا کوئی نزاع — بزمِ قومی میں نہ سلگاؤ اُسے صورتِ عود
ہر شرارہ سے بچو بھق سے اُڑا دے نہ کہیں — ایک مخزن ہے یہاں جس میں بھری ہے بارود
زید ہو - عمر ہو - یا ما و شما - کوئی ہو — سب کے ممنون ہو جو قوم کی چاہے بہبود
ہاں مگر ایک جو شوریدۂ دِل سوختہ ہے — چار سو گونجتی ہے جس کی فغانِ پُر دُود
قوم کا قیس ہے اور قیس فنا فی اللیلے — نہ وہ حاسد ہے کسی کا نہ کسی کا محسود
کشتیِ نوح کو زنہار نہ توڑو یارو! — پے کرو ناقۂ صالح کو نہ جوں قومِ ثمود

اور ہی چیز ہے وہ اُس کو نہ چھیڑو زنہار
اور ہی شخص ہے وہ اُس سے اُلجھنا بے سود

اُس سے تفضیل کا دعویٰ ہو تو دعویٰ ہے مس
اُس کی تذلیل کی خواہش ہو تو خواہش مردود

اُس کے حالات سے واقف ہے وہ دانندۂ راز
جس کے قبضہ میں ہے کل کارگہِ غیب و شہود

(۱۱) تہنیت سالگرہ ملکہ وکٹوریہ[1]

سنو حضرات! جب گوئے زمیں نے
لگائے تین سو پینسٹھ[65] ہیں چکّر

تو افضالِ الٰہی سے مع الخیر
ہوا بارِ دگر یہ دن میسّر

کوئین وکٹوریا کا رشتۂ عمر
چوہتّرواں پڑا آج اُس میں گوہر

اُسی کی تہنیت کا ہے یہ جلسہ
مسرّت اور خوشی ہے جلوہ گستر

محبّت خیر خواہی حق شناسی
نظر آتی ہے اِس جلسہ کے اندر

مجسّم صورتیں مہر و وفا کی
اگر ہوتیں نہ ہوتیں ہم سے بہتر

خوشی کا دن ہے اور وہ تہنیت ہے
کہ جس کا جوش ہے سب میں برابر

غرض ہم سب خدا سے چاہتے ہیں
دوامِ دولت و اقبالِ قیصر

---

[1] یہ قطعہ بہ تقریبِ تہنیت سال گرہ حضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند ۱۸۹۲ء میں سید اقبال احمد صاحب مرحوم نے پڑھا تھا۔

(۱۲) قطعہ تاریخ وفات سیّد اقبال احمد مرحوم[1]

الا یا ایہا الاخوان و احباب
کہ تھے ہم بھی تمہاری طرح خوش حال

بہارِ نوجوانی کا تھا آغاز
قریبِ ختم تھا بائیسواں سال

ہماری آرزو کی تھی روش اور
زمانہ چل رہا تھا اور ہی چال

یکایک صدمۂ بادِ فنا سے
نہالِ تن ہوا دم بھر میں پامال

قضارا گر سرِ مدفن گزر ہو
تو ہاں سے اے دوستدارانِ خوش اعمال

دعا کرنا کہ ہو سیرابِ رحمت
ریاضِ جاوداں میں جانِ اقبال

(۱۳) مرثیہ مولوی حافظ رحیم اللہ صبا[2] (اکبرآبادی)

قصۂ دردِ جاں گزا سُنیئے
ماجرائے الم فزا کہیئے

پوچھیے نالہ و فغاں کا سبب
موجبِ گریۂ و بُکا کہیئے

کیوں سمجھیے فسادِ آب وہوا
کیوں ستمگاریٔ وبا کہیئے

موت کو دیجیے نہ کچھ الزام
کارفرمائیِ قضا کہیئے

عمر کو کیجیے سفینہ شمار
دہر کو لجّۂ فنا کہیئے

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۳ء [2] مرتبہ ۱۸۹۷ء

ہے عبث علت و مرض کا بیاں ہاں فقط مرضی خدا کہیے
وہ جو تھی بزمِ صحبتِ احباب اب اُسے مجلسِ عزا کہیے
کیجیے ماتمِ رحیم اللہ نوحۂ رحلتِ صبا کہیے
اکبر آباد کا ادیبِ اریب کر گیا کوچ ہائے کیا کہیے
فضل و دانش میں علم و حکمت میں بے بدل فی زماننا کہیے
عربی کے کلام کا انداز امرء القیس دوسرا کہیے
سخنِ فارسی کی راہ و روش آفریں اور مرحبا کہیے
دیکھیے ریختہ کی آن و ادا ثانیِ میر و میرزا کہیے
کیجیے شیونِ سخندانی علم و دانش کا مرثیا کہیے
کر کے شعر و سخن سے قطع نظر صاحبِ صدق و باصفا کہیے
ہاں ز روئے محاسنِ اخلاق معدنِ حلم اور حیا کہیے
پاک دل پاک طبع نیک نہاد مخزنِ مہر اور وفا کہیے
اے خوشا وہ کہ نیک نام جیا اُس کو مقبولِ کبریا کہیے
جسم زنداں ہے روح زندانی ہو رواں تو اسے رہا کہیے

سفرِ ناگزیر کو الحق
آخریں نعمتِ خدا کہیے

(۱۴۰) ایک گدھا شیر بنا تھا[1]

پایا تھا اک گدھے نے کہیں پوستینِ شیر
سوچا کہ آڑ خوب ہے کچھ کھیلئے شکار
پہنا اور آس پاس کے کھیتوں میں جا گھسا
دیکھا جو شیر سہم گئے اُس سے کاشتکار
اتنے میں اپنی بولی جو بولا تو کھُل گیا
ہے شیر کے لباس میں پوشیدہ اک حمار
جب کھُل گیا فریب تو پھر مارے طیش کے
لے لے کے اپنی لاٹھیاں سب پل پڑے گنوار
چاروں طرف سے گھیر کے لی خوب ہی خبر
لوگوں نے مار پیٹ میں رکھا نہ کچھ اُدھار
مرنے میں کیا رہا تھا مگر خیر ہو گئی
بھاگا دبا کے دُم تو بچی اس کی جانِ زار
چھپتی نہیں ہے بات بنائی ہوئی کبھی
آخر کو ہو کے رہتی ہے اصلیّت آشکار
بچیو سدا تکلّف و نا راستی سے تم

کرتا ہے آدمی کو یہ شیوہ ذلیل و خوار
رستے کو راستی کے نہ زنہار چھوڑنا
ہوتا ہے راستی ہی سے انسان رستگار
جو بات تھی صلاح کی وہ ہم نے دی بتا
آئندہ اپنے فعل کا ہے تم کو اختیار

(۱۵) بخیلی اور فضولی[۱]

اری بخیلی! اور اے فضولی! تمھارا دونو کا منہ ہو کالا
گناہ گاری کے تم ہو چشمے۔ تمھیں سے نکلیں خراب رسمیں
تمھیں نے دم بھر میں سب گنوایا تمھیں نے سب خاک میں ملایا
کمانے والوں نے جو کمایا بصد مشقت کئی برس میں
نہ مال و دولت کے فائدوں ہی سے کر کے محروم تم نے چھوڑا
بنایا بدعہد اور بے دیں۔ کھلائیں جھوٹی ہزار قسمیں
لگا کے حرص و طمع کا پھندا۔ سکھایا خود مطلبی کا دھندا
بنایا حق تلفیوں کا بندہ۔ پھنسا کے تم نے ہوا و ہوس میں
ہوئی بخیلوں کی کیا بری گت نہ پاس عزت نہ کچھ حمیت
نہ حوصلہ ہی رہا نہ ہمت نہیں ہے فرق اُن میں اور مگس میں

[۱] مرتبہ ۱۸۹۳ء

لُٹا کے دولت کو اپنی مُسرِف ہوئے ہیں کیا کیا ذلیل احمق
کہ جیسے بے بال و پر کی چڑیا اسیر ہو گوشۂ قفس میں

(۱۶) کاشتکاری

گنجِ زر خاک سے اُگلوایا — کیمیا شغلِ کاشتکاری ہے
کر چکا جب کسان اپنا کام — پھر خدا سے امیدواری ہے
آفتِ ارضی و سماوی سے — ہے نگہباں۔ تو فضلِ باری ہے
نہیں حاصل پہ دسترس نہ سہی — بیج بُونا تو اختیاری ہے
وقت ضائع نہ کر۔ اگیتی بو — سینچ لے کھیت نہر جاری ہے
جوت۔ بو۔ سینچ۔ پھر توکّل کر — نہ کیا کچھ تو شرمساری ہے
سرسری ساگ پات کو مت جان — اس پہ تو زندگی ہماری ہے
جڑ۔ تنہ۔ ڈال۔ پات پھل اور پھول — دستِ قدرت کی نقش کاری ہے
اپنی قوّت سے قُوت حاصل کر — مُفت خواری حرام خواری ہے
کاہلی سے گھٹا نہ پیداوار — یہ تو بڑھیا گناہگاری ہے
اپنے اُوپر ستم روا مت رکھ — واجب اپنی بھی حق گزاری ہے
بیل سے پڑھ جفاکشی کا سبق — کچھ اگر تجھ میں ہوشیاری ہے
کام میں کھپ رہا ہے بیچارہ — ناشتا ہے نہ کچھ نہاری ہے

رات کاٹی جہاں سمائے سینگ — عیش و عشرت پہ لات ماری ہے
تھک گیا تو زمین پہ بیٹھ گیا — کس قدر مشق خاکساری ہے
بیل ہے پر نہیں کسی کا ڈھیل — کرتا اوروں کی غمگساری ہے
صبر و محنت کی یہ کڑی منزل — اس کو ہلکی ہے تجھ کو بھاری ہے
دیکھ چوپایہ سے نہ بازی ہار — تیری ہمت اگر اراری ہے

کچھ نہ کچھ کام کر اگر تجھ کو
آدمیت کی پاسداری ہے

(۱۷) کاشتکاری[1]

جو تو نے غفلت میں وقت کھویا نہ کھیت جوتا نہ بیج بویا
تو ایسی ڈوبی ہوئی اسامی سے کوئی حاصل بٹائے گا کیا؟
رہے گا یہ کھیت ہاتھ اُس کے جو ہل سے کشتی لڑے گا دن بھر
جو ہار بیٹھے گا اپنی ہمت تو وہ زمیں کو اُٹھائے گا کیا؟
خوراک و پوشاک کے ذخیرے دبے پڑے ہیں زمیں کے اندر
جو کر کے محنت نہ کھود لے گا تو خاک پہنے گا کھائے گا کیا؟

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۰ء

(۱۸) قرض[1]

دام بلا ہے قرض پھنسے اور ہوئے شکار
ہے پاسِ آبرو۔ تو رہو ہوشیار تم

کنیا رتے ہی رہو گے سدا قرض خواہ سے
اِس ننگ و عار کو نہ کرو اختیار تم

دیکھو! یہ قرضِ وعدہ خلافی نہ دے سکھا
ہو جاؤ گے جہان میں بے اعتبار تم

جب تک وبالِ جان نہ جانو گے قرض کو
ہرگز نہ بن سکو گے کفایت شعار تم

گر دُرِّ بے بہا ہو ارزاں کوڑیوں کے مول
زنہار بھول کر بھی نہ لینا اُدھار تم

مقروض ہو گئے تو پیادہ سے ہو بتر
مانا کہ رکھتے ہو فرسِ راہوار تم

غالب کہ ریل پر بھی ہو قطع سفر محال
جو قرض کے ٹکٹ سے ہوئے ہو سوار تم

کشتیٔ نوح پر بھی چڑھے گر بطور قرض
مجھ کو یہ خوف ہے کہ نہ پہونچو گے پار تم

مقروض کی نہیں ہے زمانہ میں آبرو
یوں اپنے دل میں بات بناؤ ہزار تم

تم جانتے ہو گرچہ بُرا سود خوار کو
ہے اصل یہ کہ بن گئے بے سود خوار تم

وہ بندۂ درم سہی اُس کا غلام کون؟
اپنے ہی دل میں سوچ لو اپنا وقار تم

پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوں نہ کارگر
لقمہ کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم

---

[1] مرتبہ ۱۸۹۳ء

(۱۹) سب سے زیادہ بدنصیب کون؟

اُس سے دنیا میں نہیں کوئی زیادہ بدبخت
جو نہ دانا ہو۔ نہ داناؤں کا مانے کہنا

آج آفت سے بچی جان تو کل خیر نہیں
ایسے نادان کا مشکل ہے سلامت رہنا

(۲۰) ہمّت

گھوڑدوڑ میں کودائی کی بازی تھی ایک دن
تازی پہ کوئی ترکی پہ اپنے سوار تھا

جو ہچکچا کے رہ گیا۔ سو رہ گیا ادھر
جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

(۲۱) اپنے فعل پر پشیمانی

پیش آئے جو مصیبت پڑتی ہے سو بھگتنی
رہتی ہے یوں تسلّی مرضی یہی تھی رب کی

پر اپنے کوتکوں سے آتی ہے جو مصیبت
ہوتی ہے ساتھ اُس کے شرمندگی غضب کی

(۲۲) معافی میں سرور ہے

نادموں کی خطا معاف کرو
ہے معافی میں لذّت اور سرور

اپنے دل میں ذرا کرو انصاف
کون ہے جو ہے بے خطا و قصور



(۲۳) انتقام علاجِ خطا ہے

جو انتقام نہ لینے سے ہو خطا افزوں
تو یہ تمھاری خطا ہے جو انتقام نہ لو
وہ کام جس سے کہ اوروں کو فائدہ پہنچے
تم اُس کے کرنے سے زنہار ہاتھ تھام نہ لو
جو انتقام سے منظور ہو خوشی اپنی
تو ایسے کام کا تم بھول کے بھی نام نہ لو

(۲۴) خطا کو خطا نہ جاننا ہلاکت ہے

ہے بیمار تو۔ لیک بچنے کے قابل
گر اپنی خطا کو خطا جانتا ہے
مگر ایسے نادان کا کیا ٹھکانا
کہ جو درد ہی کو دوا جانتا ہے
بُرا مانتا ہے جو سمجھائے کوئی
بُرائی کو اپنی بھلا جانتا ہے
وہ انجام کو روئے گا سر پکڑ کر
نہیں اس میں دھوکا خدا جانتا ہے

(۲۵) ہر کام میں کمال اچھا ہے

کوئی پیشہ ہو زراعت۔ یا تجارت۔ یا کہ علم
چاہیئے انسان کو پیدا کرے اُس میں کمال
کاملوں کی عمر بڑھ جاتی ہے خود کر لو حساب
با ہنر کا ایک دن اور بے ہنر کا ایک سال

(۲۶) دور اندیشی

جنھیں دی ہے خدا نے عقلِ دانا ہے اُن کو آج ہی سے فکر کل کی
مسافر چل پڑا جو آخرِ شب تو ہو جاتی ہے منزل اُس کی ہلکی

(۲۷) بدی کے عوض میں نیکی کرنا

ہر ایک جانور کا یہی خاصہ ہے بدی کے عوض میں بدی کی تو کیا کی
ہے البتہ وہ شخص انسانِ کامل جفا کے مقابل میں جس نے وفا کی

(۲۸) قول و فعل میں مطابقت چاہیئے

دیرینہ رسم و راہ سے قطع نظر کرو برتاؤ آج کل کے زمانہ کے اور ہیں
دل شرق میں پڑا ہے یہ کہتے ہیں غرب کی کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور ہیں

(۲۹) دل کی یک سوئی خلوت ہے

اگر دل گرفتار ہے مخمصوں میں تو خلوت بھی بازار سے کم نہیں ہے
مگر جس کے دل کو ہے یکسوئی حاصل تو وہ انجمن میں بھی خلوت نشیں ہے

غزلیات

(الف)

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی! کیا آسماں بنایا!

پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا

مٹّی سے بیل بوٹے کیا خوش نما اُگائے!
پہنا کے سبز خلعت اُن کو جواں بنایا

خوش رنگ اور خوشبو گل پھول ہیں کھلائے
اِس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا

میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے
چکھنے سے جن کے مجھ کو شیریں دہاں بنایا

سورج سے ہم نے پائی گرمی بھی روشنی بھی
کیا خوب چشمہ تو نے اے مہرباں بنایا

سورج بنا کے تو نے رونق جہاں کو بخشی
رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکاں بنایا

پیاسی زمیں کے مُنہ میں مینھ کا چوایا پانی
اور بادلوں کو تو نے مینھ کا نشاں بنایا

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری اِن کو تسبیح خواں بنایا

تنکے اُٹھا اُٹھا کر لائیں کہاں کہاں سے
کس خوبصورتی سے پھر آشیاں بنایا

اونچی اُڑیں ہوا میں بچّوں کو پر نہ بھولیں
اُن بے پروں کا اِن کو روزی رساں بنایا

کیا دودھ دینے والی گائیں بنائیں تو نے
چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عناں بنایا

رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں میسّر
اِن نعمتوں کا مجھ کو ہے قدرداں بنایا

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاری گری ٹپکتی
یہ کارخانہ تونے کب رائیگاں بنایا

۲

علیک السلام اے شفیع البرایا
الوالعزم تجھ سا نہ آئے نہ آیا

علیک السلام اے امینِ الٰہی
کہا جو خدا نے وہ تو نے سُنایا

علیک السلام اے رفیع المدارج
کسی نے نہیں تیرے رُتبے کو پایا

علیک السلام اے ستودہ خصایل
فدا خُلق پر تیرے اپنا پرایا

علیک السلام اے جمیل الشمائل
جواد و رؤف و کریم السجایا

علیک السلام اے امانِ دو عالم
ترا دامنِ لطف ہے سب پہ چھایا

علیک السلام اے جمالِ معانی
نہ تھا تیرے جسمِ مطہّر کا سایا

علیک السلام اے محبِّ غریباں
ترے حلم نے بارِ امت اُٹھایا

علیک السلام اے ترا نورِ اقدس
ہے سلطان اور جملہ عالم رعایا

علیک السلام اے تجھے ذاتِ حق نے
جو اوّل بنایا۔ تو آخر دکھایا

علیک السلام اے شہنشاہِ وحدت
کہ توحید کا تو نے سکّہ بٹھایا

علیک السلام اے طبیبِ نہانی
دلوں میں جو تھے روگ سب کو مٹایا

علیک السلام اے شفائے مجسّم
عجب تو نے صحت کا نسخہ پلایا

علیک السلام اے سوارِ سبک رو
کسی نے تری گردِ رہ کو نہ پایا

علیک السلام اے رسالت پناہی
خدا کا ہمیں تو نے رستہ بتایا

علیک السلام اے ہدایت کے مرکز
تجھے حق نے انسانِ کامل بنایا
درود و سلام و صلوٰۃ و تحیّت
یہ لایا ہے حامدؔ[1] تحف اور ہدایا

۳

تمھارے تیر میں انداز تھا نظر کا سا
ہر ایک دل کا ہے نقشہ مرے جگر کا سا
رقیب سر بھی پٹکتے تو میں نہ ہلتا کاش
ملا نہ بخت مجھے تیرے سنگِ در کا سا
فروغِ رُخ یہ نظر میں سما گیا یک بار
کہ شام ہی سے مرا حال ہے سحر کا سا
سرِ اس غبار کا دامانِ شہسوار پہ ہے
ملا فرشتہ کو رتبہ کہاں بشر کا سا
پیامِ مرگ سے لیتا ہوں میں شگونِ وصال
گماں ہے تیر پہ بھی مرغِ نامہ بر کا سا
کسی کی برقِ تبسم جو دل میں کوند گئی
تو چشمِ تر کا ہوا حال ابرِ تر کا سا

۴

ذرّہ ذرّہ حیرتی ہے مہرِ پُر تنویر کا
بے خودی آئینہ ہے ہنگامۂ تکبیر کا
بیٹھ ہی جاتی ہے دل میں گو سمجھ میں کچھ نہ آئے
میں تو دیوانہ ہوں اُس کی دل رُبا تقریر کا
ہے مسلّم نازِ یکتائی اُسے ہر رنگ میں
جلوۂ نقش آفریں خاکہ ہو جس تصویر کا
توڑ ا صنام ہوا اور دل کو ویرانہ بنا
ہے یہی سنگِ بنا اِس کعبہ کی تعمیر کا
حیف وہ سائل کہ کچھ دے کر جسے رخصت کیا
وائے وہ نالہ صلہ جس کو ملا تاثیر کا
عیب پوشی کو ہمیشہ کام فرمایا کیے
کشتۂ الطاف ہوں یارانِ بے تدبیر کا

[1] یہ سلام محمد حامد جوان مرگ فرزند مصنف کی فرمایش سے لکھا گیا تھا۔

باغباں کی کارفرمائی سے دیتا ہے خبر — گلشنِ عالم میں چلنا صرصرِ تغیر کا
اُس کے آنے کی توقع کر رہی ہے نفخِ روح — صورِ اسرافیل ہے کھٹکا مجھے زنجیر کا
غایتِ ترکیبِ اعضا ہے یہی کچھ کام کر — کاہلی اے بے خبر منشا نہیں تقدیر کا
جرم بھی اور خیرگی! یہ سیرتِ ابلیس ہے — ابنِ آدم کو ہے شایاں عذر ہی تقصیر کا
ہے اشارہ پر قلم کے لشکروں کی صلح و جنگ — دو گرہ کی چوب سے دم بند ہے شمشیر کا

آہ کھانا ہی پڑا داغِ فراقِ دائمی
قہر تھا ہونا کبھی اک لمحہ کی تاخیر کا

سلہ۵

دل گیا ہاتھ سے کیا ہاتھ سے داماں نکلا — کہ ترے پاؤں کی مانند گریباں نکلا
مر گئے دیکھ کے آثارِ سحر شامِ وصال — دشمنِ جاں ستم کش رُخِ جاناں نکلا
دیکھ بے ہوش مجھے اشک فشاں ہیں احباب — جذبۂ شوق تو بدخواہِ عزیزاں نکلا
چارۂ جوشِ جنوں خانہ خرابی نہ ہوئی — گھر سمجھتے تھے جسے ہم سو بیاباں نکلا
کس قدر دل میں مرے جوشِ شکستِ دل ہے — کوئی سالم نہ ترے تیر کا پیکاں نکلا
بس کہ ہے نقشِ قدم دامِ گرفتاریٔ جاں — اُن کے ہر گام پہ اک گنجِ شہیداں نکلا
پھر گئے دل ہی بیک گردشِ چشمِ کافر — دَور میں کوئی بھی تیرے نہ مسلماں نکلا
آخری وقت کے وعدہ نے کیا شادیٔ مرگ — ہمرہِ جاں دلِ مایوس کا ارماں نکلا

نکلے تم غیر کے گھر سے کہ مری جاں نکلی
جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا

سلہ۵ مرتبہ ۱۸۶۷ء

تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا ۱؎
دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا

ڈر کر ہلاک بوالہوسِ بے ادب ہوا
اُن کو بھی میری جان شکنی سے عجب ہوا

لبریزِ شکوہ ہائے تغافل تھا میں ولے
لو شکر کا سبب گِلہ بے سبب ہوا

لیتے ہیں ترکِ عشق سکھانے کے واسطے
دل نذرِ جاں فزائی حُسنِ طلب ہوا

کیا آگے اُس کے ولولۂ شوق سر اُٹھائے
سجدہ کیا تو ملزمِ ترکِ ادب ہوا

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا
اب مہرباں ہو گئے یہ کیا غضب ہوا

اُن کا نہ آستانہ سے باہر قدم بڑھا
سو بار انتظار میں ہیں جاں بلب ہوا

ہے بے لبِ زباں بھی غُل تیرے نام کا ۲؎
محرم نہیں ہے گوش مگر اِس پیام کا

خوش ہے ملامت اہلِ خرابات کے لئے
اس سلسلہ میں نام نہیں ننگ و نام کا

نخوت ہے جس کے کاسۂ سر میں بھری ہوئی
کب مستحق ہے محفلِ رنداں میں جام کا

جاگیرِ دَرد پہ ہمیں سرکارِ عشق نے
تحریر کر دیا ہے وثیقہ دوام کا

وادیِ عشق میں نہ ملا کوئی ہم سفر
سنتے تھے نام خضر علیہ السلام کا

آسودگی نہ ڈھونڈ کہ جاتا ہے کارواں
لے مستعار برق سے وقفہ قیام کا

کھولا ہے مجھ پہ سِرِّ حقیقت مجاز نے
یہ پختگی صِلہ ہے خیالاتِ خام کا

کھاتا نہیں فریبِ تمنّائے دو جہاں
خوگر نہیں ہے توسنِ ہمّت لگام کا

مت رکھ طمع سے چشمِ تمتّع کہ ہے یہاں
دانہ ہر ایک مردمکِ دیدہ دام کا

۱؎ مرتبہ ۱۱ مئی ۱۸۷۳ء ۲؎ مرتبہ ۱۸۷۳ء

پہونچا دیا خدودِ دو عالم سے بھی پرے — مُطرب نے راگ چھیڑ دیا کس مقام کا
ظلمت میں کیا تمیز سفید و سیاہ کی — فرقت میں کچھ حساب نہیں صبح و شام کا
جس کی نظر ہے صنعتِ ابرونگار پر — ہے وہ قتیلِ تیغ۔ نہ کشتہ نیام کا
کھانے کو اے حریص غمِ عشق کم نہیں — یہ ہو تو کچھ بھی فکر نہ کر قرض و وام کا
ہیں بے قرار۔ منزلِ مقصود بے نشاں — رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا
گر دیکھئے تو خاطرِ ناشاد شاد ہے — سچ پوچھئے تو ہے دلِ ناکام کام کا

اُٹھے تری نقاب تو اُٹھ جائے ایک بار
سب تفرقہ یہ روز و شب و صبح و شام کا

رسوا ہوئے بغیر نہ نازِ بتاں اُٹھا — جب ہو گئے سبک تو یہ بارِ گراں اُٹھا
معنی میں کر تلاشِ معاشِ دماغ و دل — حیواں صفت نہ لذتِ کام و دہاں اُٹھا
گر خندہ یاد آئے تو سینہ کو چاک کر — گر غمزہ یاد آئے تو زخمِ سناں اُٹھا
یا آنکھ اُٹھا کے چشمِ فسوں ساز کو نہ دیکھ — یا عمر بھر مصائبِ دورِ زماں اُٹھا
اُس انجمن میں جائیے اب کس امید پر — ہم بیٹھنے نہ پائے۔ کہ وہ بدگماں اُٹھا
بے یادِ دوست عمرِ گرامی نہ صرف کر — اس گنجِ شائگاں کو نہ یوں رائگاں اُٹھا
وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہے — پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا

پروانہ کی تپش نے خدا جانے کان میں
کیا کہدیا۔ کہ شمع کے سر سے دھواں اُٹھا

۹

میں در پہ ترے ناصیہ سا ہو نہیں سکتا
دشمن کا بھی نقشِ کفِ پا ہو نہیں سکتا

باقی نہ رہی غیر کو اب جائے شکایت
شکرِ ستمِ یار ادا ہو نہیں سکتا

سب کچھ تو کیا ہم نے پہ کچھ بھی نہ کیا ہائے
حیران ہیں کیا جانئے کیا ہو نہیں سکتا

اس کوچہ میں کیوں غیرِ شب و روز ہیں پھرتے
گر چرخ سے جز جور و جفا ہو نہیں سکتا

اعدا سے ہوئے وہ شفرہ عدہ خلافی
میں منکرِ تاثیرِ دعا ہو نہیں سکتا

پامال کیا بے سر و پائی نے صد افسوس
دل ہم قدمِ رنگِ حنا ہو نہیں سکتا

جس دل سے کدورت نہ گئی خاک ہے وہ دل
کیا آئینہ جو اہلِ صفا ہو نہیں سکتا

۱۰ ا؎

وہیں ہے جب کہ اشارہ ہو خود نمائی کا
عجب کہ بندہ نہ دعوے کرے خدائی کا

ملے جو رتبہ ترے در کی جبہ سائی کا
تو ایک سلسلہ ہو شاہی و گدائی کا

نہیں ہے فیض میں خست ولیک پیدا ہے
تفاوت آئینہ و سنگ میں صفائی کا

یہاں جو عشق ہے بے تابِ جلوۂ دیدار
وہاں بھی حسن محرّک ہے خود نمائی کا

بتوں کے سامنے بت گر گھسے جبینِ نیاز
میں شیفتہ ہوں تری شانِ کبریائی کا

نہ کر کسی کی برائی - نہ بن بھلے سے برا
بھلا بھلا ہے برا کام ہے برائی کا

بنائیں بگڑی ہوئی کو تو ایک بات بھی ہے
بگاڑنا نہیں مشکل بنی بنائی کا

اٹھا حجاب تو بس دین و دل دیئے ہی بنی
جنابِ شیخ کو دعوے تھا پارسائی کا

تمھارے دل سے کدورت مٹائے تو جانیں
کھلا ہے شہر میں اک محکمہ صفائی کا

ا؎ مرتبہ ۱۸۸۳ء

ہوس نہ ہے گر سر و ساماں کے جمع کرنے کی | تلاش کر سر و سامان بے نوائی کا
سوائے عشق نہیں کوئی رہبر چالاک | وہاں خرد کو نہیں حوصلہ رسائی کا
اُسی کا وصف ہے مقصود شعر خوانی سے | اُسی کا ذکر ہے منشا غزل سرائی کا

نہیں ہے اب کے زمانہ کی یہ روش زنہار
میں یادگار رہوں خاقانی و سنائی کا

"

آغازِ عشق عمر کا انجام ہوگیا | ناکامیوں کے غم میں مرا کام ہوگیا
تم روز و شب جو دستِ بدستِ عدو پھرے | میں پائمالِ گردشِ ایام ہوگیا
میرا نشاں مٹا تو مٹا پر یہ رشک ہے | وردِ زبانِ خلق ترا نام ہوگیا
دل چاک چاک نغمۂ ناقوس نے کیا | سب پارہ پارہ جامۂ احرام ہوگیا
اب اور ڈھونڈیے کوئی جولاں گہ جنوں | صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہوگیا
دل پیچ سے نہ طرۂ پُرخم کے چھٹ سکا | بالاروی سے مرغِ تہ دام ہوگیا
اور اپنے حق میں طعن تغافل غضب ہوا | غیروں سے ملتفت بتِ خودکام ہوگیا
تاثیر جذبہ کیا ہو کہ دلِ اضطراب میں | تسکیں پذیر بوسہ بہ پیغام ہوگیا
کیا اب بھی مجھ پہ فرض نہیں دوستی کفر | وہ ضد سے میری دشمنِ اسلام ہوگیا
اللہ رے بوسۂ لبِ مے گوں کی آرزو | میں خاک ہو کے دُردِ تہ جام ہوگیا
اب تک بھی ہے نظر طرفِ بامِ ماہ وش | میں گرچہ آفتابِ لبِ بام ہوگیا
اب حرفِ ناسزا میں بھی اُن کو دریغ ہے | کیوں مجکو ذوقِ لذتِ دشنام ہوگیا

نامہربانیوں سے یوں پائمال کرنا ۱۲ھ ہیہات! دوستوں کو دشمن خیال کرنا
روزِ جزا میں آخر۔ پوچھا نہ جائے گا کیا؟ تیرا یہ چُپ لگانا۔ میرا سوال کرنا
او شہسوار اتنی اچھی نہیں ہے عجلت ہیں چند پاشکستہ۔ ان کا خیال کرنا

ناقص بھی کاملوں سے کچھ کم نہیں کہ ان سے
سیکھا ہے کاملوں نے کسبِ کمال کرنا

کام اگر حسب مدعا نہ ہوا ۱۳ھ تیرا چاہا ہوا برا نہ ہوا
خاک اُڑتی جو ہم خدا ہوتے بندگی کا بھی حق ادا نہ ہوا
سب جتایا کئے نیازِ قدیم وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
رخشِ ایام کو قرار کہاں اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا
کیا کھلے؟ جو کبھی نہ تھا پنہاں کیوں ملے؟ جو کبھی جدا نہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
جو گدھا خوئے بد کی دلدل میں جا پھنسا پھر کبھی رہا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا

رہ روِ مسلکِ توکل ہے
وہ۔ جو محتاج غیر کا نہ ہوا

نتیجہ کیونکر اچھا ہو نہ ہو جب ۱۴ھ تک عمل اچھا
نہیں بویا ہے تخم اچھا تو کب پاؤ گے پھل اچھا

۱ھ مرتبہ ۱۸۸۰ء

کرو مت آج کل حضرت! بُرائی کو ابھی چھوڑو
نہیں جو کام اچھّا - وہ نہ آج اچھّا نہ کل اچھّا
بُرے کو تنگ بھی کرنے اور توقع نیک نامی کی
دماغ اپنا سنوارو تم! نہیں ہے یہ خلل اچھّا
جو ہو جائے خطا کوئی - کہ آخر آدمی ہو تم
تو جتنا جلد ممکن ہو کرو اُس کا بدل اچھّا

۱۵

ذرا غم زدوں کے بھی غم خوار رہنا | کریں ناز تو ناز بردار رہنا
فراخی و عسرت میں، شادی و غم میں | بہرحال یاروں کے تم یار رہنا
سمجھ نردباں اپنی ناکامیوں کو | کہ ہے شرطِ ہمّت طلب گار رہنا
کرو شکر ہے یہ عنایت خدا کی | بلاؤں میں اکثر گرفتار رہنا
اگر آدمی کو نہ ہو مشغلہ کچھ | بہشتِ بریں میں ہو دشوار رہنا
خبر بھی ہے آدم سے جنّت چھٹی کیوں | خلافِ جبلّت تھا بے کار رہنا

سمجھتے ہیں شیروں کو بھی نرم چارہ
غزالانِ شہری سے ہشیار رہنا

۱۶

یاد تیری یاد ہے نامِ خدا | ورنہ ہم کیا تھا؟ اور ہمارا یاد کیا؟
صدر آرا تو جہاں ہو صدر ہے | آگرہ کیا اور الٰہ آباد کیا
مبدأِ فیّاض کے شاگرد کو | حاجتِ آموزشِ استاد کیا

اِک کسوٹی ہے ترے کردار کی
مرتبہ کیا مال کیا اولاد کیا

۱۷
نقابِ جور میں روپوش اک لطفِ نہاں نکلا — وہ میرے حال پر مجھ سے بھی زیادہ مہرباں نکلا
نہ تھا بزمِ احبّا ہی میں میرا ذکر دشمن بھی — بیاں کرتا سرِ بازار تیری داستاں نکلا
حجابِ شاہدِ مطلق نہ اُٹھّا ہے نہ اُٹھّے گا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اک مکاں نکلا

۱۸
جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا — نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہگار ہوتا
مئے بیخودی کا ساقی! مجھے ایک جرعہ بس تھا — نہ کبھی نشہ اُترتا۔ نہ کبھی خمار ہوتا
میں کبھی کا مر بھی رہتا۔ نہ غمِ فراق سہتا — اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
یہ جو عشقِ جانستاں ہے۔ یہ وہ بحرِ بیکراں ہے — نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اِس سے پار ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

۱۹
سنوگے مجھ سے میرا ماجرا کیا؟ — کہا کرتے ہیں افسانوں میں کیا کیا؟
نہیں تشویشِ آئندہ کہ ہو کب؟ — گزشتہ کا تحیّر ہے کہ تھا کیا؟
نہ کر تفتیش ہے خلوت نشیں کون؟ — تامّل کر کہ ہے یہ برملا کیا؟
ہے اک آئینہ خانہ بزمِ کثرت — بتاؤں غیر کس کو؟ ماسوا کیا؟

جو نکلا ہی نہ ہو قعرِ عدم سے | بگاڑے گی اُسے موجِ فنا کیا؟
فقط مذکور ہے اک نسبتِ خاص | مقدّر ہے خبر کیا؟ مبتدا کیا؟
جہاں نقشِ قدم ہو روحِ قدسی | وہاں پہنچے گی عقلِ نارسا کیا؟

لگاؤں "شیئاً لِلّٰہ" کی صدا کیوں؟
بھلا دوں "یفعل اللہ ما یشاء" کیا؟

۲۰

سلام

محرم کا چاند آسماں پر جو چمکا | تو یاد آگیا واقعہ رنج و غم کا
مصیبت کا بیداد کا بے کسی کا | غضب کا جفا کا بلا کا ستم کا
وطن سے جدا دشتِ غربت میں جاکر | ہوا قتل کنبہ شفیع الامم کا
یہ شیرانِ حق۔ اور وہ دنیا کے کتّے | لیئموں نے کاٹا سر اہلِ کرم کا
کیا ظلم بے وجہ سلطانِ دیں پر | یہ لالچ تھا دنیا کے جاہ و حشم کا
شہیدوں کی ہے تشنگی یاد آتی | نہ ہو چشمہ لبریز کیوں چشمِ نم کا
رضا اور تسلیم صبر و توکّل | مصیبت میں شیوہ تھا اہلِ کرم کا
یہ وہ دن ہے جس دن میں ڈھایا گیا ہے | جو کعبہ عرب کا۔ تو قبلہ عجم کا
برستی ہے دیوار و در سے اُداسی | ہے چھایا ہوا ابر رنج و الم کا
تڑپتی ہے بجلی تو روتے ہیں بادل | کہ ہے آج کا دن شہیدوں کے غم کا

کرے کوئی تحریر و تقریر کیونکر
نہ جرأت زباں کی نہ یارا قلم کا

متفرقات

سب جھوٹ ہے کوئی کیا کرے گا — ہو گا وہی جو خدا کرے گا
کرنے دو بدی کرے جو کوئی — اُس کا بھی خدا بھلا کرے گا
خواہشوں نے ڈبو دیا دل کو — ورنہ یہ بحرِ بیکراں ہوتا

ردیف (ب)

کیا کیا اجل نے جان چرائی تمام شب — کوئی بھی آرزو نہ بر آئی تمام شب
دل سوز کب ہوئے ہیں کہ جب خاک ہو گیا — تربت پہ میری شمع جلائی تمام شب
لے وائے تلخ کامیِ روزینہ فراق — ناصح سے جانِ غم زدہ کھائی تمام شب
ازبس یقینِ وعدۂ دیدارِ خواب تھا — کیا خوش ہوئے کہ نیند نہ آئی تمام شب
اِک آہِ دل نشیں ہیں وہ بت منفعل ہوا — واللہ کیا ندامت اٹھائی تمام شب

لگتے ہی آنکھ دیکھ لیا جلوۂ نہاں
پیشِ نظر تھی شانِ خدائی تمام شب

ردیف (ض)

نہیں معلوم کیا واجب ہے کیا فرض
مرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض

شعورِ ہستیِ موہوم ہے کفر
فنا بعدِ فنا بعدِ فنا فرض

نہیں آگاہ مستِ بادۂ شوق
کہاں سنّت کدھر واجب کجا فرض

رہِ تسلیم میں از روئے فتوے
دعا واجب پہ ترکِ مدّعا فرض

نہ چھوٹے کفر میں بھی وضعِ ایماں
کہ ہر حالت میں ہے یادِ خدا فرض

نہیں دیکھا کسی نے حُسنِ مستور
بقدرِ فہم لیکن کرلیا فرض

نہ مانوں گا نہ مانوں گا کبھی میں
مجھے کرتے ہیں کیوں اس سے جدا فرض

نہ کھولوں گا نہ کھولوں گا زباں کو
کہ ہے اخفائے رازِ دلربا فرض

بلا سے کوئی مانے یا نہ مانے
چلو ہم کر چکے اپنا ادا فرض

ردیف (میم)

السلام اے شاہِ شاہاں السلام
السلام اے نورِ امکاں السلام

اے تہی دستوں کے حامی مرحبا
اے شفیعِ اہلِ عصیاں السلام

السلام اے سجدہ گاہِ قدسیاں
اے رسولِ خاصِ یزداں السلام

السلام اے رحمۃ للعالمین رہ نمائے حق پڑو ہاں السلام
السلام اے بادشاہِ جن و انس وارثِ ملکِ سلیماں السلام
اے تری باتیں کلامِ کردگار اے ترا دل عرشِ رحماں السلام
افتخارِ آدم و نوح و خلیل اے عرب کے مہرِ تاباں السلام
بت پرستی تیرے آنے سے مٹی قبلہ گاہِ حق پرستاں السلام
تھا جو کوہستان و ریگستانِ عرب کر دیا تو نے گلستاں السلام
فتح کر ڈالے ترے خدام نے مصر و شام و روم و یوناں السلام
ہو گئے سب تیری دعوت میں شریک تُرک و ایران و خراساں السلام
یا نبی السیف یا نور الہدیٰ مسلکِ حق کے نگہباں السلام
شاہدِ انجیل و توریت و زبور موردِ آیاتِ قرآں السلام
کشتیِ دوراں کو ہے تجھ سے قیام لنگرِ کشتیِ دوراں السلام
جان و ایماں کو ملی تجھ سے شفا اے طبیبِ جان و ایماں السلام

عرضِ حامدؔ ہے یہی با صد نیاز
اے عرب کے مہرِ تاباں السلام

ردیف (ن)

(۱)

ظاہر تو ہے تو میں نہاں ہوں باطن تو ہے۔ تو میں عیاں ہوں

۵۴ یہ سلام محمد حامد جوان مرگ فرزند مصنف کی فرمایش سے لکھا گیا تھا۔

تو ہی ظاہر ہے۔ تو ہی باطن
تو ہی تو ہے تو میں کہاں ہوں

تیرے ہوتے کہیں نہیں میں
اوّل۔ آخر۔ نہ درمیاں ہوں

تو تو میں میں نے مار ڈالا
دم بند ہے کیجئے نہ ہاں ہوں

میں ہی لیلےٰ ہوں میں ہی محمل
ناقہ بھی ہوں میں ہی ساربان ہوں

ہوں کُنجِ قفس میں بند لیکن
بیرونِ زمین و آسماں ہوں

دریا کی طرح رواں ہوں لیکن
اب تک بھی وہیں ہوں میں جہاں ہوں

جز نام نہیں نشان میرا
سچ مچ میں بحرِ بیکراں ہوں

وہ پیرہنِ جان میں جاں جلوۂ تن میں[1]
ہوں وہم جدائی سے عجب رنج و محن میں

مقصود زیارت ہے اگر کعبۂ دل کی
ہو گرم سفر ناحیۂ ملکِ وطن میں

وہ قامتِ دلکش ہے عجب فتنۂ عالم
چھپتا ہی نہیں پیرہنِ نو و کہن میں

اے شمع ابھا اشک چھپا رازِ محبت
خاکستر پروانہ ہے بیتاب لگن میں

شورش مری بیجا ہے نہ فریاد نکمی
رونق ہے ذرا نالۂ بلبل سے چمن میں

تاثیر ہو کیا خاک جو باتوں میں گھڑت ہو
کچھ بات نکلتی ہے تو بے ساختہ پن میں

کمتر ہے دد و دام سے انساں بمراتب
ہر دم جو ترقی نہ کرے چال چلن میں

ہوں میں تو وہی معتکفِ گوشۂ عزلت
حالانکہ مرا ریختہ پہنچا ہے دکن میں

یہ سچ ہے کہ سودا بھی تھا اُستادِ زمانہ
میری تو مگر میر ہی تھا شعر کے فن میں

[1] مرقبہ ۱۷ دسمبر ۱۸۷۳ء

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں
شرماؤ گے تمھیں نہ کرو ضد حجاب میں

پامال شوخیوں میں کرو تم زمین کو
ڈالوں فلک پہ زلزلہ میں اضطراب میں

روشن ہے آفتاب کی نسبت چراغ سے
نسبت وہی ہے آپ میں اور آفتاب میں

دل کی گرہ نہ وا ہوئی در دا شبِ وصال
گزری تمام بست و کشادِ نقاب میں

رنجِ عتاب زاہدِ مسکیں کو مفت ہے
یہاں اتقا میں سعی وہاں اجتناب میں

جاں میں نے نامہ بر کے قدم پر نثار کی
تھا پیش ہا فتادہ یہ مضموں جواب میں

ہنس ہنس کے برق کو تو ذرا کیجے بے قرار
رو رو کے ابر کو میں ڈبوتا ہوں آب میں

واعظ سے ڈر گئے کہ نہ شامل ہوئے ہم آج
ترتیبِ محفلِ مے و چنگ و رباب میں

ساقی ادھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں
کچھ مستیٔ نگہ بھی ملا دے شراب میں

داخل نہ دشمنوں میں نہ احباب میں شمار
مد فضول ہوں میں تمھارے حساب میں

کس کس کے جور اٹھائیں گے آگے کو دیکھیے
دشمن ہے چرخ پیر زمانِ شباب میں

پیغام بر اشارۂ ابرو سے مر گیا
پھر جی اٹھے گا لب بھی ہلا دو جواب میں



۴

جہاں تیغِ ہمّت علم دیکھتے ہیں
محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں

جو بیٹھے تھے یاں پا بدامانِ ہستی
اُنھیں سر بجیبِ عدم دیکھتے ہیں

کمالاتِ صانع پہ جن کی نظر ہے
وہ خوبیِ مصنوع کم دیکھتے ہیں

نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں
اُنھیں دم بدم تازہ دم دیکھتے ہیں

نہیں جن کو جاہ و حشم کا تکبّر
وہی لطفِ جاہ و حشم دیکھتے ہیں

شکم پروری جن کا شیوہ ہے اُن کو
اسیرِ جفائے شکم دیکھتے ہیں

بس اے رنگ و بو تو نہ کر ناز بیجا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

اُڑاتے ہیں جو رخشِ ہمّت کو سرپٹ
وہ منزل کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

۵

سلامت ہے سر تو سرہانے بہت ہیں
مجھے دل لگی کے ٹھکانے بہت ہیں

جو تشریف لاؤ تو ہے کون مانع
مگر خوئے بد کو بہانے بہت ہیں

اثر کر گئی نفسِ رہزن کی دھمکی
کہ یاں مرد کم اور زنانے بہت ہیں

معطّل نہیں بیٹھتے شغل والے
شکار افگنوں کو نشانے بہت ہیں

کرو دل کے ویرانہ کی کُنج کاوی
دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں

نہ اے شمع رو رو کے مر شام ہی سے
ابھی تجکو آنسو بہانے بہت ہیں

ہوا میری روداد پر حکم آخر
کہ مشہور ایسے فسانے بہت ہیں

نہیں ریل یا تار برقی پہ موقوف
چھپے قدرتی کارخانے بہت ہیں

بچے کیونکہ بیچارہ مرغ گرسنہ ۔۔۔ بکثرت ہیں دام اور دانے بہت ہیں

بس ایک آستانہ ہے سجدہ کے قابل
زمانہ میں گو آستانے بہت ہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں ۔۔۔ آگے حواس گم خردِ نارسا کے ہیں
ممنونِ برگِ گل ہیں نہ شرمندۂ صبا ۔۔۔ ہم بلبل اور ہی چمنِ دلکشا کے ہیں
کیا کوہ کن کی کوہ کنی کیا جنونِ قیس ۔۔۔ وادیِ عشق میں یہ مقام ابتدا کے ہیں
بنیان عمر ست ہے اور منعمانِ دہر ۔۔۔ مغرور اپنے کوشکِ عالی بنا کے ہیں
اپنے وجود کا ابھی عقدہ کھلا نہیں ۔۔۔ مصروف حل و عقد میں ارض و سما کے ہیں
شیخ اور برہمن میں اگر لاگ ہے تو ہو ۔۔۔ دونو شکار غمزہ اُسی دلربا کے ہیں
جن کو عنایتِ ازلی سے ہے چشم داشت ۔۔۔ وہ معتقد دعا کے نہ قائل دوا کے ہیں
لایا نہیں ہنوز نویدِ وصالِ دوست ۔۔۔ ہم شکوہ سنج سستیِ پیکِ صبا کے ہیں
سمجھو اگر۔ تو ہیں وہی سب سے حریص تر ۔۔۔ طالب خدا سے جو دلِ بے مدعا کے ہیں
ان بددلوں نے عشق کو بدنام کر دیا ۔۔۔ جو مرتکب شکایتِ جور و جفا کے ہیں
ہمت ہمائے اوجِ سعادت ہے مرد کو ۔۔۔ اُلّو ہیں وہ جو شیفتہ ظلِّ ہما کے ہیں
ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو ۔۔۔ یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں
جو باندھتے ہیں طرۂ طرار کا خیال ۔۔۔ ناداں امیدوار نزولِ بلا کے ہیں
کھٹکا ابھی کچھ ہوا نہیں اور دل اُڑا لیا ۔۔۔ یہ سارے ہتکھنڈے تری زلفِ دوتا کے ہیں

صید کرشمہ اس لئے ہوتے نہیں کہ ہم
پہلے سے زخم خوردہ فریب وفا کے ہیں

مارا بھی اور مار کے زندہ بھی کر دیا
یہ شعبدے تو شوخیِ ناز و ادا کے ہیں

خلوت میں بھی روا نہیں گستاخیِ نگاہ
پردے پڑے ہوئے ابھی شرم و حیا کے ہیں

یوں کہہ رہی ہے نرگسِ بیمار کی ادا
نسخے تو مجھکو یاد ہزاروں شفا کے ہیں

اب تک ہے سجدہ گاہ عزیزانِ روزگار
جس خاک پر نشان تری کفشِ پا کے ہیں

اندیشہ ہے کہ دے نہ ادھر کی اُدھر لگا
مجکو تو ناپسند وتیرے صبا کے ہیں

سیرِ ورودِ قافلۂ نوبہار دیکھ
برپا خیام اوجِ ہوا میں گھٹا کے ہیں

جاتا ہے خاک پاک دکن کو یہ ریختہ
واں قدرداں اس گہرِ بے بہا کے ہیں

احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں
ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

زمانہ اُن سے کراتا ہے آج خارکشی
جو محوِ سرو و صنوبر تھے خانہ باغوں میں

اُنھیں پہ گردشِ ایّام کا گرا نزلہ
سمائی بوئے گُلِ ولہ تھی جن دماغوں میں

وہ عطرِ فتنہ سے بستا تھا جن کا پیراہن
میسّر اب اُنھیں روغن نہیں چراغوں میں

وہ مانگ تانگ کے پیتے ہیں اوکھ سے پانی
بھری تھی جن کے مئے مشکبو ایاغوں میں

۹

منزل دراز و دور ہے اور ہم میں دم نہیں
ہوں ریل پہ سوار تو دام و درم نہیں

میدانِ زندگی میں کریں دوڑ دھوپ کیا
ہم ایسے ناتواں ہیں کہ اٹھتا قدم نہیں

کیا خوب ہاتھ پانو خدا نے عطا کیے
چلتے رہیں تو حاجتِ خیل و خدم نہیں

اغیار کیوں دخیل ہیں بزمِ سرور میں
مانا کہ یار کم ہیں پر اتنے تو کم نہیں

جب تک ہے عشق و عاشق و معشوق میں تمیز
کھلتا کسی پہ رازِ حدوث و قدم نہیں

آدم پہ معترض ہوں فرشتے تو کیا عجب
چکھی ہنوز چاشنیِ زہرِ غم نہیں

اظہارِ حال کا بھی ذریعہ نہیں رہا
دل اتنا جل گیا ہے کہ آنکھوں میں نم نہیں

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا
ورنہ دیارِ حسن میں رسمِ ستم نہیں

ارشادِ طبع کی نہ اگر پیروی کرے
نقاشیِ خیال مجالِ قلم نہیں

سر ہی کے بل گئے ہیں سدا رہرانِ عشق
حیرت زدہ نہ بن کہ نشانِ قدم نہیں

کیسی طلب کہاں کی طلب کس لئے طلب
ہم میں تو وہ نہیں ہے جو وہ ہے تو ہم نہیں

۹

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

مر چکے جیتے جی خوشا قسمت!
اِس سے اچھی تو زندگی ہی نہیں

دوستی اور کسی غرض کے لئے!
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

یا وفا ہی نہ تھی زمانہ میں
یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں

کچھ مری بات کیمیا تو نہ تھی
ایسی بگڑی کہ پھر بنی ہی نہیں

جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام
غم سے بدتر ہے وہ خوشی ہی نہیں

بندگی کا شعور ہے جب تک
بندہ پرور! وہ بندگی ہی نہیں

ایک دو گھونٹ جامِ وحدت کے جو نہ پی لے وہ متّقی ہی نہیں
کی ہے زاہد نے آپ دُنیا ترک
یا مقدّر میں اُس کے تھی ہی نہیں

عارضِ روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہوگئیں
کفر کی گمراہیاں ہمرنگِ ایماں ہوگئیں
زُلف دیکھی اُس کی جن قوموں نے وہ کافر بنیں
رُخ نظر آیا جنھیں وہ سب مسلماں ہوگئیں
خود فروشی حُسن کو جب سے ہوئی مدِّ نظر
نرخِ دل بھی گھٹ گیا جانیں بھی ارزاں ہوگئیں
جو بنائیں تھیں کبھی ایوانِ کسریٰ کا جواب
گردشِ افلاک سے گردِ بیاباں ہوگئیں
خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مُشکلیں جب بندھ گئی ہمّت سب آساں ہوگئیں
ہائے کس کو روئیے اور کس کی خاطر پیٹئے
کیسی کیسی صورتیں نظروں سے پنہاں ہوگئیں
کیا اِنھیں اندوہِ ہنگامِ سحر یاد آگیا۔
شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہوگئیں

اک فرشتے بھی تو ہیں جن کو نہ محنت ہے نہ رنج

خواہشِ دل کی بلائے جانِ انساں ہوگئیں

کیا ہے وہ جانِ مجسّم جس کے شوقِ دید میں

جامۂ تن پھینک کر روحیں بھی عُریاں ہوگئیں

تھی وہ توفیقِ الٰہی میں نے سمجھا اپنا فعل

طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہوگئیں

خاک سے افلاک تک ہے وردِ تیرے نام کا — 11 کون سی محفل ہے وہ جس میں ترا چرچا نہیں

اوّل و آخر بھی تو ہے ظاہر و باطن بھی تو — تو ہی تو ہے پر کہیں ۔ تیرا پتا لگتا نہیں

سب سمائے تجھ میں ہیں یا تو سمایا سب میں ہے — اس پہیلی کو کسی نے آج تک بوجھا نہیں

الف
حامد کہاں! کہ دوڑ کے جاؤں خبر کو میں — 12 کس آرزو پہ قطع کروں اس سفر کو میں

مانا بری خبر ہے پہ تیری خبر تو ہے — صبر و قرار نذر کروں نامہ بر کو میں

یہ سنگ و خشت آہ دلاتے ہیں تیری یاد — روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

ہے تیری شکل یا تیری آواز کا خیال — کرتا ہوں التفات یکایک جدھر کو میں

افسوس ہائے ہائے کی آتی نہیں صدا — پوچھے تو کیا بتاؤں ترے چارہ گر کو میں

کیا ہوگیا اسے کہ تجھے دیکھتی نہیں — جی چاہتا ہے آگ لگا دوں نظر کو میں

اچھا جو تو نے گوشۂ مرقد کیا پسند — اب اپنے حق میں گور بناؤں گا گھر کو میں

تیرے سرِ عزیز کی بالش ہو خاک سے — بالینِ غم سے اب نہ اٹھاؤں گا سر کو میں

ملف - محمد حامد فرزند مصنف نے ۲۱ر اکتوبر ۱۸۹۶ء کو انتقال کیا تھا۔ اس جوان مرگ کے ماتم میں یہ مرثیہ بمقام آگرہ لکھا گیا

دیکھی نہ تھی بہار ابھی تیرے شباب کی بھولا نہ تھا ابھی تیرے عہدِ صغر کو میں
تقدیر ہی نے ہائے! نہ کی کچھ مساعدت کیا روؤں اب دعا و دوا کے اثر کو میں
حکمِ خدا یہی تھا کہ بیٹھا کیا کروں ماتم میں تیرے اشک فشاں چشمِ تر کو میں
جز درد و داغ تو نے نہ چھوڑا نشاں حیف!! رکھوں گا میہماں انھیں عمر بھر کو میں
کرنے دو آہ و نالہ کہ آخر رہوں گا بیٹھ تسلیم کر کے حکمِ قضا و قدر کو میں
کیا فکر آب و ناں! کہ غم کہہ رہا ہے اب موجود ہوں ضیافتِ دل اور جگر کو میں
تجھ کو جوارِ رحمتِ حق میں جگہ ملے مانگا کروں گا اب یہ دعا ہر سحر کو میں
حبسِ دوام تو نہیں دنیا۔ کہ مر رہوں کاہے کو گھر خیال کروں رہ گزر کو میں
خود سم سے بھی زیادہ ہو جو سم ہلاہل وہ جام زہر دے۔ تو نہ چکھوں شکر کو میں
وہ جانے اور اُس کی رضا جو پسند ہو سب کام سونپتا ہوں اُسی دادگر کو میں

ہوتا نہ دل میں درد۔ تو کرتا نہ ہائے ہائے
دیتا نہ طول یوں سخنِ مختصر کو میں

۱۳

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں ہے یہ تری ہی صدا غیر کی آواز نہیں
کہہ سکے کون وہ کیا ہے، مگر از روئے یقیں گُل نہیں شمع نہیں۔ سرو سرافراز نہیں
دل ہو بے لوث تو کیا وجہِ تسلّی ہو دروغ طائرِ مُردہ مگر طعمۂ شہباز نہیں
بلبلوں کا تھا جہاں صحنِ چمن میں انبوہ آج چڑیا بھی وہاں زمزمہ پرداز نہیں
بھاگ ویرانۂ دُنیا سے کہ اِس منزل میں نُزلِ مہماں بجز مائدۂ آز نہیں

دلبری جذبِ محبت کا کرشمہ ہے فقط
کچھ کرامت نہیں جادو نہیں اعجاز نہیں

دل کی تسخیر ہے شیریں سخنی پر موقوف
کچھ کرامت نہیں جادو نہیں اعجاز نہیں

دستِ قدرت نے مجھے آپ بنایا ہے تو پھر
کونسا کام ہے میرا کہ خدا ساز نہیں؟

متفرقات

قدسیوں کے بھی ہوش اُڑتے ہیں
سُن کے اس مشتِ خاک کی باتیں

دل کا احوال تو خدا جانے
ظاہرا ہیں تپاک کی باتیں

جس سے نہ انتفاع ہو ابنائے جنس کو
فرد دی ہے دفتر لیل و نہار میں

ردیف (و)[1]

وہی کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن
اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اُداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

[1] یہ نصابیہ غزل ۱۸۸۰ء میں مصنف نے اپنے بچوں کے لئے لکھی تھی ۱۲

وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بُلبلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

وہی کِذب ہے وہی جھونٹ ہے وہی جرعہ ہے وہی گھونٹ ہے
وہی جوش ہے وہی ولولہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ساتھی ہے جو رفیق ہے وہی یار ہے جو صدیق ہے
وہی مہر ہے وہی ماما تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو مراد ہے وہی مدعا وہی متقی وہی پارسا
جو پھنسے بلا میں وہ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو کہا ہے میں نے مقال ہے جو نمونہ ہے سو مثال ہے
مری سرگزشت ہے ماجرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

جو چنانچہ ہے وہی جیسا ہے جو چگونہ ہے وہی کیسا ہے۔
جو چناں چنیں ہے سو ہٰکذا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی خوار ہے جو ذلیل ہے وہی دوست ہے جو خلیل ہے

بد و نیک کیا ہے بُرا بھلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۲

پائے غیر اور میرا سر دیکھو | ٹوٹ جائے نہ سنگِ در دیکھو
ایک عالم پڑا ہے چکّر میں | گردشِ چشمِ فتنہ گر دیکھو
میں نظر بند غیر مدِّ نظر | اپنا دل اور مرا جگر دیکھو
چشم پُرنم ہے تن غبار آلود | آن کر سیرِ بحر و بر دیکھو
فکرِ افشائے راز کیوں نہ کروں | کیا حیا خیز ہے نظر دیکھو
ہے دگرگوں مریضِ غم کا حال | ہو سکے تو دوا بھی کر دیکھو
غیر جھلتے ہیں اب انھیں پنکھا | اثرِ آہِ پُر شرر دیکھو

کم نمائی و خویشتن بینی

کتنے بے دید ہو اِدھر دیکھو

۳

ہے جانِ حزیں ایک لبِ روح فزا دو | اے کاش اکا اس ایک کی ہو جائیں دوا دو
تھا خارِ جگر ہجر میں تنہا غمِ دوری | ہیں آفتِ جاں وصل میں اب شرم و حیا دو
مستانہ روش کیوں نہ چلے وہ نگہِ ناز | آنکھیں ہیں کہ ہیں جامِ مئے ہوش رُبا دو
جی تنگ ہے کیا کیجئے اور جوشِ بلا یہ | دل ایک ہے کیا دیجئے اور زلفِ دوتا دو
ہے عینِ عنایت جو نشاں پوچھئے میرا | یہ بھی نہیں منظور تو اپنا ہی پتا دو
کیا دامِ فریب اُس نے بچھایا ہے دلاویز | دو آن پھنسیں اور جو ہو جائیں رہا دو
گر نازِ خود آرا کو ہے یکتائی کا دعویٰ | کیوں آئنہ دیکھا کہ ہوئے جلوہ نما دو

بے باکی و شوخی بھی ہے اور شرم و حیا بھی
دو محرمِ اسرار ہیں تو پردہ کشا دو
دو گیسو و دو زلف بلاخیز ہیں چاروں
ہاں کاکلِ خمدار بھی ہیں ان کے سوا دو
وہ طرز وروش ہائے! وہ انداز و ادا حیف
کیا بیچتے دل و جان۔ کجا چار کجا دو

سیری نظر بھی نہ ہوئی ہائے میسّر
آنکھیں جو ہوئیں چار لگے تیرِ قضا دو

معشوقِ دل نواز اگر تند خو نہ ہو
ثابت خلوصِ عاشق ولافِ عدو نہ ہو
وہاں سجدۂ نیاز کی مٹّی خراب ہے
جب تک کہ آب دیدہ سے تازہ وضو نہ ہو
وہ جنّتِ وصال جہاں تو ہو میں نہ ہوں
وہ دوزخِ فراق جہاں میں ہوں تو نہ ہو
خمخانہ ہے کرامتِ پیرِ مغاں سے پُر
زنہار منکرِ مے و جام و سبو نہ ہو
بلبل کے دل میں داغِ وداعِ بہار ہے
یارب! کوئی فریفتۂ رنگ و بو نہ ہو
شرمِ گناہ نے تو ڈبویا ہی تھا مجھے
گر دستگیر مژدۂ لا تقنطو نہ ہو
افسانہائے شوق سناتا ہوں میں اُسے
جو عالمِ خیال میں بھی روبرو نہ ہو
حسنِ غیور میں ہے شکوہِ یگانگی
ہو دیدِ محض اور کوئی روبرو نہ ہو
دل میں کسک نہ ہو تو سمجھے اُسے مریض
زنہار دردِ دل کے لئے چارہ جو نہ ہو

ہے کائنات گردِ رہِ کاروانِ عشق
وہ دل ہی کیا کہ جس میں تری جستجو نہ ہو

کیا مانگتے جس کا کبھی چسکا نہ لگا ہو
دی راہِ خدا ہم کو بھی ساقی کا بھلا ہو

کر پیرِ خرابات سے دریوزۂ ہمت — جا خاکِ درِ میکدہ پر ناصیہ سا ہو
بے حوصلگی ہے گلۂ تلخیِ دوراں — جو دیں اُسے پی جایئے گو زہر ملا ہو
آنے کو ہے اب شاہدِ گل پردہ سے باہر — آمادۂ مشاطگی اے بادِ صبا ہو
جب ہم سے نبھے رسمِ ملاقات تو جانیں — تسلیم کیا تم ہمہ تن مہر و وفا ہو
سر رشتۂ آمالِ دو عالم ہے ترے ہاتھ — پھر کاہے کا اُلجھاؤ۔ جو تو عقدہ کشا ہو
تنگی سے نہ دل تنگ ہو۔ جا شکرِ خدا کر — اے خوش وہ دلِ تنگ۔ کہ راضی برضا ہو
گاہک ہی نہ ہو کوئی تو ہے عرضِ ہنر ہیچ — اے وائے گلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو
اس غنچۂ دلگیر کی تقدیر کہ زنہار — تحریکِ نسیمِ سحری سے بھی نہ وا ہو

ہمت کے لئے عار ہے احسان اٹھانا
وہ درد بھی اچھا جو نہ محتاجِ دوا ہو

٦
بچ گنہ سے ورنہ توبہ اور استغفار کر — کھونپ جب کپڑے میں آئی چارہ کیا غیر از رفو
سنگریزہ تھا فقط گر لعل میں ہوتا نہ رنگ — کوئلے سے تھا بتر گر مشک میں ہوتی نہ بو
تائب اور معصوم ہیں دونوں بری پر فرق ہے — ایک مادر زاد طاہر۔ ایک بعد از شست و شو
گر نہ ہو نیکی، دماغی قوتیں برباد ہیں — بوستاں سرسبز ہوتا ہی نہیں بے آبِ جو

متفرقات

میں پٹکتا ہی رہ گیا سر کو — چل دیئے وہ پیادہ پا گھر کو

دو جگہ خفتگانِ خاک مجھے
تھوڑے تھوڑے ذرا پرے سرکو

ان غفلتوں سے داغ ہوں لیکن خدا کرے
تاخیر کا سبب کوئی اس کے سوا نہ ہو

ردیف (ی)

ناصح جو ملامت میں محابا نہیں کرتے ۱
انصاف کریں دل میں۔ کہ وہ کیا نہیں کرتے

اظہارِ مشیخت ہے نشاں بے ہنری کا
جو اہلِ ہنر ہیں کبھی دعوےٰ نہیں کرتے

کہتے بھی ہیں پھر صاف مکر جاتے ہیں کہہ کر
کیا شخص ہیں کچھ خوف خدا کا نہیں کرتے

دردِ دلِ آزردہ سے ہے جن کو خبر کچھ
آزار کسی کا بھی گوارا نہیں کرتے

جاں کاہیوں کے بعد جنھیں ملتی ہے دولت
وہ مفت میں دولت کو لٹایا نہیں کرتے

کیا یہی ہے جس پہ ہم دیتے ہیں جاں ۲
یا کوئی دنیائے فانی اور ہے

یوں تو ہر انسان گویا ہے مگر
شیوۂ شیوا بیانی اور ہے

چل رہی ہے جس سے جسمانی مشین
کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے

دل نے پیدا کی کہاں سے یہ ترنگ
کوئی تحریکِ نہانی اور ہے

غیر سمجھا ہے کسے اے ہم نشیں؟
میرے دل میں بدگمانی اور ہے

تم نے کب دیکھا ہے بے رنگی کا رنگ
بے نشانی کی نشانی اور ہے

۳

دھوکے میں نہ آجائیو افسونِ زباں کے
ہر چند کہ بڑا اپنی فصاحت کی یہ ہانکے

کچھ ظلم ہے جو کرتے ہیں کرم حضرتِ ناصح
تھے ورنہ مرے ایسے ہوا خواہ کہاں کے

وہ اُڑنے لگے مثلِ پری۔ دوشِ ہوا پر
بیٹھے ہیں بھروسے پہ یہاں طبعِ رواں کے

ہے وادیٔ وحدت میں اگر نیّتِ پرواز
پر نوچ کے دے پھینک یقیں اور گماں کے

۴

پھر کچھ کچھ اُن کے وعدہ پہ اب اعتبار ہے
مایوس مرگ پھر دلِ امّیدوار ہے

گن گن کے ایک ایک گھڑی کاٹنی پڑی
ہے یہ شبِ فراق کہ روزِ شمار ہے

سروِ رواں کو دیکھ کے خجلت سے پا بگِل
گویا ہر ایک سرو لبِ جوئبار ہے

چل میکدہ کو۔ بیٹھ نہ گوشہ میں تنگ دل
زاہد! وسیع رحمتِ پروردگار ہے

۵

گر نشے میں کوئی بے فکرِ تامل باندھے
چشمِ مے گوں کو تری جام پر از مُل باندھے

ذکرِ قامت میں اگر فکر ترقّی نہ کرے
رشکِ طوبیٰ تو لکھے گو بہ تنزّل باندھے

طبع کی سلسلہ جنباں جو پریشانی ہو
گیسوئے غالیہ سا کو ترے سنبل باندھے

نالہ تو وہ ہے کہ گھبرا کے اُٹھا دے پردہ
لیک نظارہ کی ہمّت بھی تحمّل باندھے

کچھ نہ بن آئے گی جب لوٹ مچائیگی خزاں
غنچہ ہر چند گرہ کس کے زرِ گُل باندھے

روبرو اُس کے لب عرضِ تمنّا نہ ہلے
زورِ افسون نظر سے گئے بالکل باندھے

ہیں ترے بندِ قبا عقدۂ دشوار مرے
کہ جو کھولے نہ کھلے اور جو گئے کھُل باندھے

نہ بچے پر نہ بچے سیلِ فنا سے نہ بچے
گر کوئی کنگرہ چرخ پہ بھی پُل باندھے

آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اُس نے فوراً
بندِ برقع کے باندازِ تغافل باندھے

ہائے وہ صید کہ صیاد کے پیچھے لپکے
سر کو فتراک پہ ہر دم بہ تفاول باندھے

نکہتِ طرۂ مشکیں جو صبا لائی ہے
کوئی آوارہ ہوا ہے کوئی سودائی ہے

بےخودی سے ہے یہاں بےخبری کا عالم
خود نمائی کو وہاں شغلِ خود آرائی ہے

اپنی ہی جلوہ گری ہے یہ کوئی اور نہیں
غور سے دیکھ اگر آنکھ میں بینائی ہے

ہے مجھے کشمکشِ سعی و طلب سے نفرت
دِل مرا ترکِ تمنّا کا تمنّائی ہے

جز دلِ پاک نہ پایا حرمِ خاص کہیں
دیر و کعبہ میں عبث ناصیہ فرسائی ہے

ناز کی جلوہ گری کے لئے منظر ہے نیاز
ناتوانی مری ہم رنگِ توانائی ہے

جب طبیعت ہی نہ حاضر ہو تو بےسود ہے فکر
شعر گوئی تو کہاں قافیہ پیمائی ہے

مُنہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائیں ابھی
بات جو پیرِ خرابات نے سمجھائی ہے

خود منادی و مُنادی ہوں نہ غیبت نہ حضور
عالمِ غیب سے یوں دِل میں ندا آئی ہے

دل یہ کہتا ہے کہ حاصل کی ہے تحصیل عبث
نہ تمنّا کوئی شے ہے نہ تمنّائی ہے

بیخودی سی بیخودی ہے جلوہ دیدار سے
نیند آئی مجھ کو فیضِ دولتِ بیدار سے

ہے جو لطف آمیز اشارہ ابروئے خمدار سے
وہ فسونگر کاٹتا ہے دردِ سر تلوار سے

ہم نے اندازِ جنوں سیکھا ہے اک ہشیار سے
دو گھڑی کا شغل ہے اطفال کوئی یار سے

ابتدا سے حشر کا سنتے چلے آتے تھے نام
ہو گیا حاصل یقیں بارے تری رفتار سے

اس کی گنجائش ہے آغوشِ تصور میں محال
جس کا سایہ شوخ تر ہو انجمِ سیّار سے

ہے تہیدستی جہنم اہلِ حرص و آز کو
رات دن جلتے ہیں داغِ درہم و دینار سے

شوخی و غمزہ کرشمہ عشوہ انداز و ادا
ہے دلِ تنہا مقابل لشکرِ جرّار سے

رہ گئی تیرے سوا شاید تمنّا اور بھی
کچھ کھٹکتے ہیں ابھی پہلوئے دل میں خار سے

یار نازک طبع ہے اور داستانِ غم دراز
دوستو گھبرا نجائے وہ مرے طومار سے

عشق بے تابِ وصال اور حسن استغنا پسند
کس طرح تسکینِ دل ہو وعدۂ دیدار سے

ہیں زمین و آسماں ہنگامۂ وحدت سے پُر
مجکو آتی ہے یہ میری ہی صدا کہسار سے

۸

وہ حسن لازوال ہماری نظر میں ہے
شانِ کمال صورتِ ہر خیر و شر میں ہے،

ہے سنگ میں شرار تو برق ابر تر میں ہے
شوخی وہی ہے شان نئی بحر و بر میں ہے،

بتلا دیا ہے راہ نمانے مجھے پتا
دنیا بھی اک مقام ترے رہگزر میں ہے،

اسرارِ عشق بھی کہیں دیکھے ہیں واعظو!
دخل آپ کو بہت کتبِ معتبر میں ہے

باطن کو بھی نہ صورتِ ظاہر پہ کر قیاس
انگور میں شراب شکر نیشکر میں ہے

البتہ اس کے فضل پہ موقوف ہے نجات
کچھ زہدِ خشک میں ہے نہ دامانِ تر میں ہے

بیرونِ عرش و فرش ہے پرواز مرغِ دل
از بس ہوائے شوق بھری بال و پر میں ہے

بے رغبتی سے شب کو سحر بھی کیا تو کیا | تاثیر نالۂ شب و آہِ سحر میں ہے
چل شاہ راہ دل میں اور اتوسن طلب | وحشت کا جوش چاہیے صحرا بھی گھر میں ہے

یہ وہ مرض ہے جس سے معالج نہ بچ سکے
مجھ سے زیادہ دردِ دل چارہ گر میں ہے

۹

پُر حُسن خود نما سے زمان و زمین ہے | زاہد ہنوز منتظرِ حورِ عین ہے
صحرائے عشق کی بھی عجب سرزمین ہے | ہمدم نہ ہم سفر نہ کوئی ہم نشین ہے
سرگشتگانِ شوق سے راہِ وصال پوچھ | لے شرق و غرب ہے نہ یسار و یمین ہے
ہے توسنِ خیال تگ و تاز میں سدا | اس رخش پر بندھا ہوا ہر وقت زین ہے
ہے قیدِ آب و خاک سے باہر مقامِ دل | مانا خمیر مایہ مرا ماءُ طین ہے
تیرے سوا اُسے نظر آتا نہیں کوئی | حاصل جہان میں جسے عین الیقین ہے

احباب پھر بھی کرتے ہیں مجھ سے مطالبہ
ہر چند لاخراج غزل کی زمین ہے

۱۰

کجا[1] ہستی بتا دے تو کہاں ہے | جسے کہتے ہیں بسمل نیم جاں ہے
ہمارا گھر ہے یعنی خانۂ ماست | محل ہی کاخ ہے کوشک مکاں ہے
چچا عم ہے پسر بیٹا پدر باپ | تو کنبا خانمان و دودماں ہے
سفینہ ناؤ کشتی بان ملاح | بہے پانی تو وہ آبِ رواں ہے
بتاؤ آگ کیا ہے نار و آتش | دھواں کیا چیز ہے دود و دخاں ہے

[1] غزل نصابیہ۔

جسے کہتے ہو تم گردوں گرداں | فلک چرخ و سپہر و آسماں ہے
وہی جنت کہ جسکی آرزو ہے | نعیم و خلد و فردوس و جناں ہے
سنا کیجیے حکایت ہے کہانی | کہا کیجے فسانہ داستاں ہے
مرا سر راس ہے ماتھا جبیں ہے | مرے مُنہ میں زباں ہے جو لساں ہے
کہو تم جو ترازو ہے سو میزاں | سنو تم آزمائش امتحاں ہے
حجر پتھر ہے اور قرطاس کاغذ | سبک ہلکا ہے اور بھاری گراں ہے
عصا لاٹھی۔ علم نیزہ۔ سناں بھال | جسے ہم قوس کہتے ہیں کماں ہے
نہاں و مستتر پوشیدہ مخفی | جو بارز ہے تو ظاہر ہے عیاں ہے
اگر جانو ہو تم ریوڑ کو گلّہ | تو چرواہا بھی راعی اور شباں ہے
جو بھیدی ہے تو محرم رازداں ہے | کہا کرتے ہیں شاعر کو سخنداں
ہما بجا آ دم جائے کہ ہستی | وہیں آیا ہوں میں بھی تو جہاں ہے

یہی کون و مکاں دنیا ہے عالم
یہی گیتی ہی گیہاں ہے جہاں ہے

۱۱

نذرانۂ پیرجی غلام محمد صاحب لدھیانوی بروز پنجشنبہ ۲۹ جولائی ۱۸۹۶ء

اُلٹی ہر ایک رسم جہانِ شعور ہے | سیدھی سی اک غزل مجھے لکھنی ضرور ہے
وحدت میں اعتبارِ حدوث و قدم نہیں | تھا جو بطون میں یہ وہی تو ظہور ہے

تارک وہی ہے جس نے کیا کل کو اختیار
یعنی حریص تر ہے وہی جو صبور ہے

مطلق یگانگی ہے تو نزدیک و دور کیا
پہنچا ہے جو قریب وہی دور دور ہے

اصلِ حیات ہے یہی کہتے ہیں جس کو موت
جینے کی آرزو ہے تو مرنا ضرور ہے

اقرارِ بندگی ہے خدائی کا ادّعا
عجز و نیاز کیا ہے ؟ کمالِ غرور ہے

اُمّید کیجیے اگر امّید پہ کچھ نہیں
غم کھائیے بہت جو خیالِ سرور ہے

زلفِ سیاہ سے رُخِ تاباں کا حُسن ہے
کہتے ہو جس کو دیو حقیقت میں حور ہے

بے معصیت خزانۂ رحمت ہے رائیگاں
سچ پوچھئے تو جرم نہ کرنا قصور ہے

اظہارِ جانِ پاک ہے جسمِ کثیف سے
بے پردگی حجاب ہے ظلمت ہی نور ہے

بالاتفاق ہستیِ وہمی ہے نیستی
ہشیار ہے جو نشۂ غفلت میں چور ہے

اعلیٰ تھا جس کا رتبہ وہ اسفل میں ہے اسیر
صفّ نعال موقفِ صدر الصدور ہے

ہے راہ کی تلاش تو کر گمرہی طلب
عاقل وہی ہے عقل میں جس کی فتور ہے

بیداریِ وجود ہے خوابِ عدم میں غرق
لب بند ہو گئے یہی شورِ نشور ہے

ہر چند شغلِ شعر نہیں آج کل مگر
نذرانہ پیر جی کے لئے کچھ ضرور ہے

۱۲

ہے وصف ترا محیطِ اعظم
یاں تاب کسے شناوری کی

دے زندگی اور اُس کا ساماں
کیا شان ہے بندہ پروری کی

شاہنشہِ وقت ہے وہ جس نے
تیرے در کی گداگری کی

بد تر ہوں ولے کرم سے تیرے | اُمید قوی ہے بہتری کی
کیا آنکھ کو تل دیا کہ جس میں | وسعت ہے چرخِ چنبری کی
دیکھا تو وہی ہے راہ و رہرو | پھر اُس نے ہے آپ رہبری کی
ہر شکل میں تھا وہی نمودار | ہم نے ہی نگاہ سرسری کی
کیا بات ہے گر کیا ترحّم | ہیہات جو تو نے داوری کی
کی بعدِ خزاں بہار پیدا | سوکھی ٹہنی ہری بھری کی
جھوٹ اور مبالغہ نے افسوس | عزّت کھو دی سخنوری کی

لکھی تھی غزل یہ آگرہ میں
پہلی تاریخ جنوری کی

۱۳

کچھ ایسے دلفریب شگوفے کھلا کئے | مشقِ خیال سے نہ بنی دل جدا کئے
دریا تو ہے وہی جو ہوا داخلِ محیط | وادی میں ورنہ سیکڑوں نالے بہا کئے
ابنائے روزگار میں ایسا بھی کوئی ہے | جس نے حقوقِ صحبتِ یاراں ادا کئے
ذاتِ بشر میں کوئی کرامت ضرور ہے | کیوں بات بات اُس کی فرشتے لکھا کئے
انسان کی زمام ہے خصلت کے ہاتھ میں | اہلِ جفا کو چین کہاں بے جفا کئے
بد قسمتی سے تو ہی نہ دوڑا وگرنہ یاں | دن رات خوانِ نعمتِ الواں لٹا کئے
زار و زبوں ہیں آج زمانہ کے ہاتھ سے | غافل جو بزم ناز کو بیٹھے سجا کئے
شاید کوئی لطیفۂ غیبی ہو آشکار | بیٹھے ہوئے ہیں تکیہ بفضلِ خدا کئے

شکرِ خدا کہ وجہ شکایت نہیں رہی — مدّت ہوئی ہے ترکِ امیدِ وفا کیے
بخشا ہے اہتزاز تجھے کس نے، اے نسیم — بندِ قبائے غنچہ اگر تو نے وا کیے

۱۴

جو دل ہو تنگ تو جا شکر کر گلوں کو دیکھ — شگفتگی نے چمن کی ہوا نہ کھانے دی
کیا جو کبر تو شیطاں کے ہاتھ کیا آیا — وہی عزیز ہے عزّت جسے خدا نے دی
ترے عطا ہے مری احتیاج سے سابق — کبھی سوال کی نوبت نہ تو نے آنے دی
نہ عرض حال کی میں آپ کر سکا جرأت — نہ پوچھنے کی اجازت انھیں حیا نے دی
اٹھی نہ نوبت دھوم دھام کی تسکین — وفورِ یاس نے قسمت نہ آزمانے دی
کشود کار سے تسکینِ دل کبھی نہ ہوئی — عجب نشاط تھی جو ترکِ مدّعا نے دی
گدا و شاہ سے یکساں معاملہ ہے وہاں
کوئی بتائے کہ مہلت کسے قضا نے دی

۱۵

غم مونسِ تنہائی تھا آتے ہی تمھارے — کہتا ہے پھر آجاؤں گا جب یاد کروگے
دلداریٔ سرکار سے کچھ جائیں گے ڈنکے — دل سے دہِ ویراں کو جو آباد کروگے
احسان کے پھندے سے چھڑائیگا مجھے کون — مانا کہ غلامی سے تم آزاد کروگے
عالم کے صحیفہ میں یہ قدرت کی نگارش — دیکھوگے تو ہر نکتہ پہ تم صاد کروگے
واعظ کی تو بکواس سمجھ میں نہیں آتی
یا حضرتِ دل تم بھی کچھ ارشاد کروگے

۱۶

کس لئے پروانہ خاکستر ہوا — شمع کیوں اپنی جلن میں گھل گئی

منتشر کیوں ہو گئے اوراقِ گُل　　　چیختی گلشن سے کیوں بلبل گئی
آبدیدہ ہو کے شبنم کیوں چلی　　　دم کے دم کانٹوں میں آکر ٹل گئی
سبزۂ طرفِ خیاباں کیا ہوا　　　آہ کیوں شادابیِ سنبل گئی
کچھ نہ تھا خوابِ پریشاں کے سوا　　　اِس تھیٹر کی حقیقت کھُل گئی

راہ کے رنج و تعب کا کیا گلہ
جب کہ دل سے گردِ کُلفت دھُل گئی

۱۷

خارج ہے عہدِ طفلی و پیری حساب سے　　　البتہ زندگی ہے عبارت شباب سے
ہر چند گفتگو کی نہ باقی رہے مجال　　　لیکن زبان دراز نہ چوکے جواب سے
ہے دعویٔ خلوص تو کانوں پہ ہاتھ رکھ　　　بیمِ عذاب اور امیدِ ثواب سے
بے نور سینہ حفظِ سفینہ سے فائدہ　　　معنی سے ہے کتاب نہ معنی کتاب سے
وہ اور ہی نوا ہے محرّک سرور کی　　　باہر گلوئے مطرب و تارِ رباب سے
کیا کہنے آدمی کے عجب چیز ہیں جناب　　　برتر ملائکہ سے فروتر دواب سے

سوجھیں وہ بدعتیں کہ خدایا تری پناہ
فرصت اگر ملے بھی ہمیں خورد و خواب سے

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے　　　پھر چمن اور آشیانہ اور ہے
ہاں دلِ بے تاب! چندے انتظار　　　امن و راحت کا ٹھکانا اور ہے
شمع پھیکی، رات کم، محفل اُداس　　　اب مُغنّی کا ترانہ اور ہے

اے جوانی تو کہانی ہوگئی　　ہم نہیں وہ یا زمانہ اور ہے
جس کو جانِ زندگانی کہہ سکیں　　وہ حیاتِ جاودانہ اور ہے
جس کو سن کر زہرۂ سنگ آب ہو　　آہ وہ غمگیں فسانہ اور ہے
وا اگر سمعِ رضا ہو تو کہوں　　ایک پندِ مشفقانہ اور ہے
اتفاقی ہے یہاں کا ارتباط
سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہے

۱۹

راہ و رسم خط کتابت ہی سہی　　گل نہیں تو گل کی نکہت ہی سہی
دل لگی کا کوئی ساماں چاہیئے　　قحطِ معنی ہو تو صورت ہی سہی
بے دماغی بندہ پرور اس قدر　　آپ کی سب پر حکومت ہی سہی
دوستی کا ہیں نے کب دعوی کیا　　دور کی صاحب سلامت ہی سہی
بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے　　یادِ ایّامِ فراغت ہی سہی
وقت ملنے کا معیّن کیجیئے　　خواہ فردائے قیامت ہی سہی
حسنِ صورت کا نہ تھا اصلا فریب　　کلکِ صنعتگر کی صنعت ہی سہی
کچھ نہ کرنا بھی مگر اک کام ہے
گر نہیں صحبت تو عزلت ہی سہی

۲۰

دنیا میں تہیدست کی وقعت نہیں ہوتی　　یک جا کبھی محتاجی و عزّت نہیں ہوتی
ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے　　لیکن کبھی تبدیل جبلّت نہیں ہوتی

ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہِ طلب میں — پست اُس سے اولو العزم کی ہمت نہیں ہوتی

خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اسے مُنہ پر — جو بات کہ شایستۂ جلوت نہیں ہوتی

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت — اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے — راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی

کیا گنبدِ بے در یدِ قدرت نے بنایا — جس کی کبھی سالانہ مرمت نہیں ہوتی

انساں کی شرافت متعلق ہے عمل سے — میراث میں تقسیمِ شرافت نہیں ہوتی

پتے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو — اُس شخص کی دنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی

جو لوگ کہ ہیں دشمنیٔ نفس سے آگاہ — اُن کو تو کسی سے بھی عداوت نہیں ہوتی

ڈھاتی ہے قیامت یہی خونخوار جہاں میں — کچھ غم نہیں ہوتا جو محبت نہیں ہوتی

رخصت ہے مری جان خدا حافظ و ناصر
ہر چند کہ سیریٔ طبیعت نہیں ہوتی

۲۱

لو جان بیچ کر بھی جو فضل و ہنر ملے — جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

ملنا برا نہیں ہے ولیکن یہ لت بری — جس سے ملے بصورتِ شیر و شکر ملے

جب چشمِ آز پھوٹ گئی سب خلش مٹی — اب سنگریزہ ہاتھ لگے یا گہر ملے

ہے غارتِ متاع نشانِ دیارِ دوست — رہزن اگر ملے تو یہ سمجھو خضر ملے

ممکن نہیں بغیرِ قناعت فراغِ بال — ہر چند تودہ تودہ تجھے سیم و زر ملے

یاران بزمِ دہر میں کیا کیا تپاک تھا — لیکن جب اٹھ گئے تو نہ بارِ دگر ملے

مردِ نبرد نفس اگر ہے تو بھاگ مت | جب تک نہ خاک و خون میں دشمن کا سر ملے
جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز
قسمت سے اِن گنوں کے ہمیں چارہ گر ملے

۲۲

غیرِ توکّل نہیں چارا مجھے | اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے
حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا | صبر و قناعت نے اُبھارا مجھے
جو وہ کہے اُس کو سزاوار ہے | چون و چرا کا نہیں یارا مجھے
بے ادبوں کی ادب آموزیاں! | اُن کے بگڑنے نے سنوارا مجھے
کوششِ بے سود امشوّش نہ کر | قعر نہ بن جائے کنارا مجھے
زشتیِ پندار دلاتا ہے یاد | قصّۂ اسکندر و دارا مجھے
ننگِ مذلّت سے چھڑا لے گیا | جوششِ حمیّت کا حرارا مجھے
اوجِ معالی پہ اُڑا لے گیا | توسنِ ہمّت کا طرارا مجھے
آہ! نہیں رخصتِ افشائے راز | قصّہ تو معلوم ہے سارا مجھے
فرصتِ اوقات ہے بس مغتنم
یہ نہیں ملنے کی دوبارا مجھے

۲۳

نکلے چلے آتے ہیں تہِ خاک سے کھانے | یہ خوانِ کرم کس نے بچھایا ہے؟ خدا نے
جو دل میں ہے منہ پھوڑ کے بر رو نہیں کہتے | مارا مجھے یاروں کی درست اور بجا نے
غفلت میں ہیں سرمست بدلتے نہیں کروٹ | گو سر پہ اُٹھا لی ہے زمیں شورِ درا نے

اِسراف نے اربابِ تموّل کو ڈبویا — عالم کو تفاخر نے تو زاہد کو ریا نے
مرد اُس کو سمجھیے نہ کیا ہو جسے بدست — ایّامِ جوانی کی مئے ہوشِ ربا نے
با ایں ہمہ درماندگیٔ انساں کے یہ دعوے — کیا ذاتِ شریف ان کو بنایا ہے خدا نے

جلوت کا بھروسہ ہے نہ خلوت کی توقع
سب وہم تھا یاروں نے جو تاکے تھے ٹھکانے

۲۴

ہو رائگاں جو قطرہ سے قطرہ جدا چلے — مل جل گئے تو فیض کے دریا بہا چلے
یہ دل کا حوصلہ ہے کہ میدانِ عشق میں — تیرے سمندِ ناز کے پیچھے لگا چلے
ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل — کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے
کرتی ہے پست صف شکنوں کے بھی حوصلے — وہ رزمگاہ جس میں کہ تیغِ ادا چلے
قدسی بھی ہیں خموش نہیبِ جلال سے — اُس کو میں کیا مجال کہ پیکِ صبا چلے

جی ہی نہ چاہتا ہو تو ملنے سے فائدہ
آئے تو منہ بنائے چلے تو خفا چلے

۲۵

تبلیغِ پیام ہو گئی ہے — حجّت بھی تمام ہو گئی ہے
جب موجِ صبا اُدھر سے آئی — تفریحِ مشام ہو گئی ہے
کتنی بودی ہے طبعِ انسان — عادت کی غلام ہو گئی ہے
خواہش کہ تھی آدمی کو لازم — بڑھ کر الزام ہو گئی ہے
تمہیدِ پیام ہی میں اپنی — تقریر تمام ہو گئی ہے

بچنا کہ وبائے صحبتِ بد
اس دور میں عام ہوگئی ہے

حلقہ میں قلندروں کے آکر
تحقیق تمام ہوگئی ہے

جرگہ میں لقندروں کے جاکر
حکمت بدنام ہوگئی ہے

شیریں دہنوں کی طرزِ گفتار
مقبولِ انام ہوگئی ہے

بیجا بھی نکل گئی ہے جو بات
تحسینِ کلام ہوگئی ہے

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر
شمشیر نیام ہوگئی ہے

تکفیرِ برادرانِ دیں بھی
شرطِ اسلام ہوگئی ہے

کیا شعر کہیں کہ شاعری کی
ترکی ہی تمام ہوگئی ہے

۲۶

شبِ زندگانی سحر ہوگئی
بہر کیف اچھی بسر ہوگئی

نہ سمجھے کہ شب کیوں سحر ہوگئی
اِدھر کی زمیں سب اُدھر ہوگئی

زمانے کی بگڑی کچھ ایسی ہوا
کہ بے غیرتی بھی ہنر ہوگئی

عمائدنے کی وضع جو اختیار
وہی سب کو مدِ نظر ہوگئی

گئے جو نکل دامِ تزویر سے
ہزیمت ہی اُن کی ظفر ہوگئی

زمیں منقلب آسماں چرخ زن
اقامت بھی ہم کو سفر ہوگئی

مٹا ڈالئے لوحِ دل سے غبار
کسی سے خطا بھی اگر ہوگئی

براہِ کرم اس کو طے کیجئے
جو اَن بن کسی بات پر ہوگئی

نہ کرنا تھا بالضد مداوائے غم　　بڑی چوک اے چارہ گر ہو گئی

یہ ہنگامہ آرا ہیں سب بے خبر
وہ چپ ہیں جنھیں کچھ خبر ہو گئی

۲۷

ہیں اگر وہ ہوں جو ہونا چاہیئے　　میں ہی میں ہوں پھر مجھے کیا چاہیئے
غرقِ خُم ہونا میسّر ہو تو بس　　چاہیئے ساغر نہ مینا چاہیئے
منحصر مرنے پہ ہے فتح و شکست　　کھیل مردانہ ہے کھیلا چاہیئے
بے تکلّف پھر تو کھیوا پار ہے　　موج زن قطرہ میں دریا چاہیئے
تیر غیروں پر نہ کر تیغ و تبر　　آپ اپنے سے تبرّا چاہیئے
ہو دمِ عرضِ تجلّی پاش پاش　　سینہ مثلِ طورِ سینا چاہیئے
حُسن کی کیا ابتدا کیا انتہا　　شیفتہ بھی بے سروپا چاہیئے
پارسا بن اگر نہیں رندوں میں بار　　کچھ تو بے کاری میں کرنا چاہیئے

کفر ہے ساقی پہ خسّت کا گماں
تشنہ سرگرمِ تقاضا چاہیئے

۲۸

عیش کے جلسے ہجوم آلام کے　　شعبدے ہیں گردشِ ایّام کے
ہمّتِ مردانہ تجھکو آفریں　　کر کے چھوڑا سر ہوئی جس کام کے
صبح کے بھولے تو آئے شام کو　　دیکھیئے کب آئیں بھولے شام کے
تو ہی کر تکلیف اونیکِ صبا!　　منتظر ہیں وہ مرے پیغام کے

حاشا للہ میکدہ کے کاسہ لیس   معتقد ہوں زاہدِ علّام کے

مٹ گئی ہے دل سے آزادی کی یاد   کتنے خوگر ہو گئے ہم دام کے

اب تو چرچے جابجا ہونے لگے
واعظوں کی بانگِ بے ہنگام کے

۲۹

درد سے لبریز سینہ چاہیئے   چشمِ پُرخوں جائے مینا چاہیئے

ایسے بد افعال پر لاحول پڑھ   آدمی کو بغض و کینہ چاہیئے؟

گھُٹ کے مرجانا بھی ہے دوں ہمتی   چار و ناچار اور جینا چاہیئے

بحر ہو تو بحرِ طوفاں خیز ہو   اور بے لنگر سفینہ چاہیئے

ہے رگِ ہر برگ میں رنگِ بہار
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیئے

۳۰

مہربانی بھی ہے عتاب بھی ہے   کچھ تسلّی کچھ اضطراب بھی ہے

ہے تو اغیار سے خطاب مگر   میری ہر بات کا جواب بھی ہے

واں برابر ہے خلوت و جلوت   اُس کی بے پردگی حجاب بھی ہے

ہو قناعت تو ہے جہاں دریا   حرص غالب ہو تو سراب بھی ہے

وہ تبختر کہاں؟ تپاک کہاں؟
گرم و روشن تو آفتاب بھی ہے

۳۱

بنتی نہیں بات گفتگو کی   چلتی نہیں چال جستجو کی

تھی چھیڑ اُسی طرف سے ورنہ | میں اور مجال آرزو کی
اُس کی طلب اور مقام و منزل | احباب کی ہائے بد سلوکی

یاں زیرکی پسند نہ ادراک چاہیئے ۱۳۲ عجز و نیاز و دیدۂ نم ناک چاہیئے
آئینہ بن کہ شاہد و مشہود ایک ہے | اُس روئے پاک کو نظرِ پاک چاہیئے
سیر و سلوکِ جاں نہیں بے جذبۂ نہاں | اس راہ میں یہ توسنِ چالاک چاہیئے
گزرے امید و بیم سے یہ حوصلہ کسے؟ | رندِ خراب و عارفِ بے باک چاہیئے
ہر چشمہ آئنہ ہے رُخِ آفتاب کا | ہاں سطحِ آب بے خس و خاشاک چاہیئے
نشو و نمائے سبزہ و گل میں نہیں درنگ | ابرِ کرم کو تشنگیِ خاک چاہیئے
اصلاحِ حالِ عاشقِ دل خستہ ہے ضرور | معشوق جور پیشہ و سفّاک چاہیئے
جو عینِ نائے و نوش ہو اُس بادہ نوش کو | جام و سبو نہ خمکدہ و تاک چاہیئے

صیاد کے اثر پہ رواں ہو تو صید ہے
وہ صید ہی نہیں جسے فتراک چاہیئے

متفرقات

دید وا دید کی رخصت ہی سہی | میرے حصّہ کی قیامت ہی سہی
مہربانی بھی تو کچھ عیب نہیں | دشمنی شرطِ محبت ہی سہی

—

نعمتِ خلد تھی بشر کے لئے | خاک چاٹی نظر گزر کے لئے

—

جب غنچہ کو واشد ہوئی تحریکِ صبا سے | بلبل سے عجب کیا جو کرے نغمہ سرائی

عجب شورش دلِ غمناک میں ہے مگر در پردہ وہ بھی تاک میں ہے

رباعیات

توحید

۱

چکّھی بھی ہے تو نے دُردِ جامِ توحید یا سُن ہی لیا ہے صرف نامِ توحید
ہے کفرِ حقیقی کا نتیجہ ایماں ترکِ توحید ہے مقامِ توحید

۲- طلب

گر جور و جفا کرے تو انعام سمجھ جس کام سے وہ خوش ہو اُسے کام سمجھ
گر کفر کی راہ سے رسائی ہو وہاں اُس کُفر کو تو جادۂ اسلام سمجھ

۳ قُرب

مکشوف ہوا کہ دید حیرانی ہے معلوم ہوا کہ عِلم نادانی ہے
ڈالا ہے تلاشِ قرب نے دوری میں مشکل ہے بڑی یہی کہ آسانی ہے

۴ بے نشانی

بندہ ہوں تو اِک خدا بناؤں اپنا خالق ہوں تو اک جہاں دکھاؤں اپنا
ہے بندگی وہم اور خدائی پندار میں وہ ہوں کہ خود پتا نہ پاؤں اپنا

۵ آزادگی

کافر کو ہے بندگیِ بتوں کی غم خوار مومن کے لئے بھی ہے خدائے غفّار
سب سہل ہے یہ۔ ولیک ہونا دشوار آزادہ و بے نیاز و بیکس بے کار

۶ تعین

آیا ہوں میں جانبِ عدم ہستی سے
پیدا ہے بلند پائگی پستی سے
عجز اپنا بزور کر رہا ہوں ثابت
مجبور ہوا ہوں میں زبردستی سے

۷۔ عبودیت حجابِ ربوبیت

ڈھونڈا کرے کوئی لاکھ کیا ملتا ہے؟
دن کا کہیں رات کو پتا ملتا ہے؟
جب تک کہ ہے بندگی خدائی کا حجاب
بندہ کو بھلا کہیں خدا ملتا ہے؟

۸۔ توحید

توحید کی راہ میں ہے ویرانۂ سخت
آزادی و بے تعلقی ہے یک لخت
دنیا ہے نہ دین ہے نہ دوزخ نہ بہشت
تکیہ نہ سرائے ہے نہ چشمہ نہ درخت

۹۔ اسلاف پر فخر بیجا[۱]

اسلاف کا حصہ تھا اگر نام و نمود
پڑھتے پھرو اب اُن کے مزاروں پہ درود
کچھ ہات میں نقدِ رائج الوقت بھی ہے
یا اتنی ہی پونجی۔ ”پدرم سلطاں بود“

۱۰۔ تقریض[۲]

حقا کہ بلند ہے مقامِ اکبر
توقیعِ سخن ہے اب بنامِ اکبر
دیواں ہے لطائف و حِکَم سے معمور
اکبر کا کلام ہے کلامِ اکبر

۱۱۔ تنزیہ

تقریر سے وہ فزونِ بیان سے باہر
ادراک سے وہ بری گمان سے باہر

[۱] مرتبہ مئی ۱۹۱۰ء

اندر باہر ہے وہ نہ پیدا پنہاں ۔۔۔ سرحدِّ مکان و لامکاں سے باہر

۱۲-غیرِ حق نہیں

حق ہے تو کہاں ہے پھر مجالِ باطل ۔۔۔ حق ہے تو عبث ہے احتمالِ باطل
ناحق نہیں کوئی چیز راہِ حق میں ۔۔۔ باطل کا خیال۔ ہے خیالِ باطل

۱۳- لاموجود الا اللہ

ساقی و شراب و جام و پیمانہ کیا؟ ۔۔۔ شمع و گل و عندلیب و پروانہ کیا؟
نیک و بد و خانقاہ و مے خانہ کیا؟ ۔۔۔ ہے راہِ یگانگی میں بیگانہ کیا؟

۱۴-مظاہر

مجموعۂ خار و گل ہے زیبِ گلزار ۔۔۔ نیکی و بدی ہے جلوہ گاہِ اظہار
ہے مخمصہ اختیارِ حق و باطل ۔۔۔ ہے وسوسہ اعتبارِ یار و اغیار

۱۵-عجزِ ادراک

ہر خواہش و عرض و التجا سے توبہ ۔۔۔ ہر فکر سے ذکر سے دعا سے توبہ
ازبس کہ محال ہے سمجھنا اُس کا ۔۔۔ جو آئے سمجھ میں اُس خدا سے توبہ

۱۶-ترکِ فضولی

دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز ۔۔۔ ڈھونڈا تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا۔ پانا۔ ہے سب فضولی اپنی ۔۔۔ یہ خبط نہ ہو مجھے خدایا ہرگز

۱۷-اختلاف خیالی ہے

دراصل کہاں ہے اختلافِ احوال
کچھ رنج نہ راحت نہ مسرت نہ ملال
قربت ہے نہ بُعد ہے نہ فرقت نہ وصال
یہ بھی ہے خیال اور وہ بھی ہے خیال

۱۸- فاعلِ حقیقی حق ہے

شیطان کرتا ہے کب کسی کو گمراہ
اس راز سے ہے خدائے غالب آگاہ
ہے کام کسی کا اور کسی پر الزام
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ

۱۹- ذات کو تغیر نہیں

پُرشور الست کی ندا ہے اب بھی
جو تھی وہی آن اور ادا ہے اب بھی
ہوتی نہیں سُنّتِ الٰہی تبدیل
جس شان میں ہے وہی خدا ہے اب بھی

۲۰- تجلیات حجاب ہیں

اخفا کے لئے ہے اس قدر جوش و خروش
یاں ہوش کا مقتضا ہے بننا مدہوش
حُسنِ ازلی تو ہے ازل سے ظاہر
یعنی ہے تجلّیوں میں اپنی روپوش

۲۱- مشاہدہ

اے بارِ خدا یہ شور و غوغا کیا ہے؟
کیا چیز طلب ہے اور تمنّا کیا ہے؟
ہے کم نظری سے اشتیاقِ دیدار
جو کچھ ہے نظر میں یہ تماشا کیا ہے؟

۲۲- کسی خاص کیف کی پابندی غلط ہے

افسردگی اور گرم جوشی بھی غلط
گم گشتگی اور خود فروشی بھی غلط
کچھ کہیئے اگر تو گفتگو ہے بے جا
چپ رہیئے اگر تو ہے خموشی بھی غلط

۲۳- شہودِ حق میں غیر معدوم

الحق کہ نہیں ہے غیر ہرگز موجود — جب تک کہ ہے وہم غیر حق ہے مفقود
حق یہ ہے کہ وہم کا بھی ہونا حق ہے — حق ہے تو ہر اِک طرح سے حق ہے مشہود

۲۴- فقر

کیفیت و ذوق اور ذکر و اوراد — دین و اسلام اور کفر و الحاد
ہر رنگ ہے محو۔ ہر تعلق برباد — ہے فقر تمام علّتوں سے آزاد

۲۵- وحدت

نقاش سے ممکن ہے کہ ہو نقش خلاف — ہیں نقش میں جلوہ گر اسی کے اوصاف
ہر شے میں عیاں ہے آفتابِ وحدت — گر وہم دوئی نہ ہو تو ہے مطلع صاف

۲۶- غفلت

اِک عالمِ خواب خلق پر طاری ہے — یہ خواب میں کارخانہ سب جاری ہے
یہ خواب نہیں یہی سمجھنا ہے خواب — گر خواب کا علم ہے تو بیداری ہے

۲۷- راہِ خدا کی انتہا نہیں

جو تیز قدم تھے وہ گئے دور نکل — دیکھے بھالے بہت مقامات و محل
اس راہ کا پر کہیں نہ پایا انجام — یعنی ہے وہی ہنوز روزِ اوّل

۲۸- خود شناسی

اکثر نے ہے آخرت کی کھیتی بوئی — اکثر نے ہے عمر جستجو میں کھوئی

آخر کو اگر پتا ملا تو یہ ملا
ملنے کا نہیں سوائے اپنے کوئی

۲۹۔ مظہر

بدلا نہیں کوئی بھیس ناچاری سے
ہر رنگ ہے اختیارِ سرکاری سے
بندہ شاہد ہے اور طاعت زیور
یہ سانگ بھرا گیا ہے عیّاری سے

۳۰۔ کثرت لازمِ وحدت ہے

ہے عشق سے حسن کی صفائی ظاہر
رندی سے ہوئی ہے پارسائی ظاہر
وحدت کا ثبوت ہے ظہورِ کثرت
بندہ ہی کے دم سے ہے خدائی ظاہر

۳۱۔ طلب بے نشانی

یارب کوئی نقشِ مدعا بھی نہ رہے
اور دل میں خیالِ ماسوا بھی نہ رہے
رہ جائے تو صرف بے نشانی باقی
جو وہم میں ہے سو وہ خدا بھی نہ رہے

۳۲۔ ہستی واحد ہے

ہم عالمِ خواب میں ہیں یا ہم میں خواب
ہم خود سائل ہیں خود سوال اور جواب
آئی نہیں کوئی شے کہیں باہر سے
ہم خود ہیں مسبّب اور خود ہیں اسباب

۳۳۔ ہر شان میں حق متجلی ہے

ہے شکر درست اور شکایت زیبا
ہے کفر درست اور ہدایت زیبا
گیسوئے سیاہ اور جبینِ روشن
دونوں کی بہار ہے نہایت زیبا

۳۲ تنزیہ

مقصود ہے قیدِ جستجو سے باہر
وہ گُل ہے دلیلِ رنگ و بو سے باہر

اندر باہر کا سب تعیّن ہے غلط
مطلب ہے کلام و گفتگو سے باہر

۳۳۔ توحید

معلوم کا نام ہے نشان ہے نہ اثر
گنجایشِ علم ہے بیان ہے نہ خبر

علم اور معلوم میں دوئی کی بو ہے
اِس واسطے علم ہے حجاب الاکبر

۳۴۔ ترک ذکر و فکر

ہوتی نہیں فکر سے کوئی افزایش
چپکے رہنے میں ہے بڑی آسایش

کہنا سُننا تو ہے نہایت آساں
کہنے سُننے کی ہو اگر گنجایش

۳۴۔ ترکِ خودی

بُرہان و دلیل عین گمراہی ہے
نفی و اثبات محض جاں کاہی ہے

اِس رہ میں عبارت و اشارت ہے گم
یاں ترکِ خودی اصولِ آگاہی ہے

۳۵۔ دین و دنیا

دین اور دُنیا کا تفرقہ ہے مہمل
نیّت ہی پہ موقوف ہے تنقیحِ عمل

دنیا داری بھی عین دیں داری ہے
مرکوز ہو گر رضائے حقِ عزّ و جل

۳۶۔ وحدت

خاکِ نمناک اور تابندہ نجوم
ہیں ایک ہی قانون کے یکسر محکوم

یکسانیِ قانون کہے دیتی ہے لاریب کہ ہے ایک ہی ربِّ قیوّم

۳۷ - استقلال

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال کچھ عیب نہیں اگر چلو دھیمی چال

خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی ہاں راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

۳۸ - ایک واقعہ

کیا کہتے ہیں اس میں مفتیانِ اسلام؟ جب بیعِ مساجد سے نہیں چلتا کام

تو وجہِ کفاف کے لئے مومن کو جائز بھی ہے یا نہیں خدا کا نیلام؟

۳۹ - اصلاحِ قوم دشوار ہے

پانی میں ہے آگ کا لگانا دشوار بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار

دشوار سہی، مگر نہ اتنا جتنا بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

۴۰ - ہر کام کا نتیجہ اپنے لئے ہے

گر نیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے یا بد منشی سے کچھ بُرائی کی ہے

اپنے ہی لئے ہے سب، اوروں کے لئے اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے

۴۱ - مراسم میں فضولی

اب قوم کی جو رسم ہے سو اوّل جلول فاسد ہوئے قاعدے تو بگڑے معمول

ہے عید مذہب - نہ محرم معقول ہنسنا محمود ہے نہ رونا مقبول

۴۲- نیچر انسان کی محکوم ہے

فطرت کے مطابق اگر انساں لے کام
حیوان تو حیوان - جمادات ہوں رام

مٹی - پانی - ہوا - حرارت - بجلی
دانشمندوں کے ہیں مطیعِ احکام

۴۳- وقت رائگاں نہیں کرنا چاہیئے

بے کار نہ وقت کو گزارو یارو
یوں سست پڑے پڑے نہ ہمت ہارو

برسات کی فصل میں ہے ورزش لازم
کچھ بھی نہ کرو تو مکھیاں ہی مارو

۴۴- اتفاق میں کامیابی ہے اور نااتفاقی میں تباہی

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا
بستی میں ہر ایک شخص دلشاد رہا

جب رشک و حسد نے پھوٹ اُن میں ڈالی
دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

۴۵- ہمت

جس درجہ ہو مشکلات کی طغیانی
ہو اہلِ ہمم کو اور بھی آسانی

تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب
ہوتا ہے جب اُس کے سر سے اونچا پانی

۴۶- فنا عینِ وصال ہے

کس طور سے کس طرح سے کیونکر پایا
دل نذر کیا سراغِ دلبر پایا

باقی رہا مدعا نہ دعویٰ نہ دلیل
کھوئے گئے آپ ہی تو سب بھر پایا

۴۷- دنیا پرست دین دار

دُنیا کے لئے ہیں سب ہمارے دھندے
ظاہر طاہر ہیں اور باطن گندے

ہیں صرف زبان سے خدا کے قائل دل کی پوچھو تو خواہشوں کے بندے

۴۸۔ محبّتِ دنیا نشانِ خامی ہے

یہ قول کسی بزرگ کا سچّا ہے ڈالی سے جدا نہ ہو تو پھل کچّا ہے
چھوڑی نہیں جس نے حبِّ دنیا دل سے گو ریش سفید ہو مگر بچّا ہے

ابیات

۱۔ اچھّی بات

جو بات کہو صاف ہو۔ ستھری ہو۔ بھلی ہو۔
کڑوی نہ ہو۔ کھٹّی نہ ہو۔ مصری کی ڈلی ہو

۲۔ وقت سے کام لو

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ
کھینچنے سے بڑھتی ہے چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

۳۔ بُری صحبت سے بچو۔

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام بُرا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھّا بد نام بُرا

۴۔ خیالِ محال

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں

پراونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

۵

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیّت نہیں کام آتی دلیل اور حجّت

۶- اعتدال خیال

نہ حلوا بن - کہ چٹ کر جائیں بھوکے نہ کڑوا بن - کہ جو چکّھے سو تھوکے

۷- اعتدال غذا

نہ کھاؤ اتنا زیادہ کہ ڈال دے بیمار نہ اتنا کم ہو کہ ناطاقتی ہی ڈالے مار

۸- راستی

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

۹

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گُل کے جویا ہیں انھیں کیا خار کا کھٹکا

۱۰- اپنی حفاظت

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

۱۱

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

۱۲

تم نہ چو کو کبھی نکوئی سے ۔۔۔ کر نے دو گر خطا کرے کوئی

۱۳

ہرچند اُس کے مال سے کچھ واسطہ نہ ہو ۔۔۔ پھر بھی بُرا ہی کہتی ہے خلقت بخیل کو

۱۴

ساغرِ زرّیں ہو یا مٹّی کا ہو اِک ٹھیکرا ۔۔۔ تو نظر کر اُس پہ جو کچھ اُس کے اندر ہے بھرا



منظوماتِ فارسی

آفتابِ عالم تاب

صبح شد خواہد بر آمد آفتاب — دیدہ می مال و بیفگن رختِ خواب
خیز و در جائے بلندے کُن قیام — بر فرازِ کوہکے یا طرفِ بام
کُن نگہ در گنبدِ نیلوفری — تا تماشائے غریبے بنگری
رو بمشرق ساعتے اِستادہ باش — جلوۂ خورشید را آمادہ باش
اوّلاً یک گوئے زرّیں سر زند — بعد ازاں خطِّ شعاعی در زند
اندک اندک پُر ضیا گردد جہاں — برّ و بحر و کوہ و دشت و آسماں
لطفہا بر خاکِ ظلمانی کند — روشنی و گرمی ارزانی کند
گلبن و زرع و نخیل و مرغزار — ہر یکے از فیضِ او پُر برگ و بار
گر نتابد آفتابِ پُر ضیا — نے پرِ کاہے بیابی نے گیا
بسکہ اُفتادہ ست از ما دور تر — قُرصِ خور کوچک نماید در نظر
چوں زمیں طوفے کند بر گردِ آں — عرصۂ سالے ہمیگردد عیاں
چرخِ دیگر میزند بر خود زمیں — تا پدید آید شب و روزے چنیں
تو ہمی بینی کہ پوید آفتاب — فہم کُن خود واژگونست ایں حساب

۲۔ مناظرۂ میدان باکوہ

شنیدم کہ میداں سخن ساز کرد
بکوہے درِ گفتگو باز کرد

کہ اے کوہِ با رفعت و فرّ و جاہ
توئی از بزرگانِ ایں کارگاہ

سرت بر فرازِ ہوا بردہ
بہ زیرِ زمیں پائے افشردہ

نہیب آورد سر فرازیِ تو
بہ حیرت درم از درازیِ تو

ترا قُلّہ از ابر بالاتر ست
مُدام ست کلاہِ مِہی بر سرت

ولے فکرتم در تو حیرانی ست
کہ آخر چہ سود از تو ارزانی ست

یکے تودۂ سنگ بالائے سنگ
شُدست از وجودِ تو بس عرصہ تنگ

بدیں پیکرِ سخت و پہن و گراں
چہ نفعے رسد از تو با دیگراں

چہ داری بجز ایں درہ و سنگلاخ
نشیب و فراز و بلند و فراخ

صدا باز گردید از کوہسار
نخست انچہ سرمایہ داری بیار

بگو پیشِ من از ہنر ہائے خویش
کہ دانندہ تر ہست دانائے خویش

بگفتا نہ بینی کہ تقدیرِ پاک
ودیعت نہادست در زیرِ خاک

گُل و سبزۂ و غلہ ہا و شکر
غذا ہائے مرغوبِ ہر جانور

بسا خوردنیہا و پوشیدنی
شراب و عرقہائے نوشیدنی

کشاورز یا بد زمن دست رنج
دہم مایۂ زندگی گنج گنج

صلا داده ام از پئے خاص و عام | زخوانم رُبایند آب و طعام
خرو اسپ و گاوان و آهو و میش | کنند از گیا ہم پُرانبانِ خویش
چرد گلۂ گوسفند و بره | علفہائے شیرین و برگِ تره
اگر بلبل و طوطی و فاختہ ست | ہم از دانہ ام طعمۂ ساختہ ست
سپہرم بسر سائباں می تند | ہوا بارد و برق نوبت زند
ز بحرِ محیط ابر آید دواں | کند رود و جوہا بروئیم رواں
بسے چشمہ سار و بسے آبگیر | کشادہ بسیرابیم جوئے شیر
ہمی نفع خیزد ز آب و گلم | ذخیرہ نہد ہر کسے حاصلم
برند آدمی غلہ خروارہا | کشد کشتی از خرمنم بارہا
چہ می پُرسی اے کوہ از سودِ من | جہانیست پُر مایہ از جودِ من
اگر دیدہ بینندہ بودے ترا | چو خورشید سودم نمودے ترا
جبل داد پاسخ بہ حلم و وقار | جدل مہتراں را بود ننگ و عار
کہ اے سادہ میداں براہِ ستیز | سمندِ تفاخر مراں تند و تیز
متاعے کہ اینک بدامانِ تست | الا تا نگوئی کہ از آنِ تست
رسد ار مغانم ز دریائے ژرف | کنم اندک اندک ازاں بر تو صرف
نہ بینی کہ بر گردِ من سال و ماہ | زند خیمہ بارندہ ابرِ سیاہ
ز ہر جا نبے رو کند سوئے من | ہجوم آورد دشت و پہلوئے من

گہے ژالہ بارد گہے آب پاک | گہے برف ریزد بغار و مغاک
زند از درونِ دلم چشمہ جوش | ز دیبائے خضرم کند سبزہ پوش
بر سیم کریمانہ پیش از سوال | بہ پستی کنم نفقۂ آبِ زلال
نمِ جود و لطفم بہ ہر جا رسد | بسے سیلہا تا بصحرا رسد
بسے رود خانہ بسے آبداں | ز رشحاتِ فیضم شود تر دہاں
ہر آں نہر و جدول کہ سقائے تست | ہر آں حوض و چاہے کہ دریائے تست
دہد آبت از آبیاریِ من | بیا و ببیں خیر جاریِ من
مرا کار ہموارہ بخشندگی ست | وجودم ترا مایۂ زندگی ست
گر از من نہ بذل و نوالت رسد | زیانِ عظیمے بحالت رسد
بمانی یکے دشت ویرانۂ | نہ یک پرِ کاہے نہ یک دانۂ
اگر من نمانم بمانی خراب | نہ یک شاخِ سبزے نہ یک بُوئے آب
نہ خندد بہ دامانِ تو یک گُلے | نہ خواند بہ بستانِ تو بُلبُلے
نہ یک قرصِ ناں خیزد از کشتِ تو | نہ بیند کسے طلعتِ زشتِ تو
نہ دیّار بینی تو از بحر داں | مگر بینی آوارہ خیل دداں
تو در کُنہ قدرت مبیں سرسری | کُند ذرّہ با ذرّہ یاریگری
نہ تنہا ترا ہست با من نیاز | مرا ہست از دیگراں برگ و ساز
اگر ماہ و مہر ندو بحر و بر اند | ہمانا کہ محتاج یکدیگر اند

مکن نفیِ حکمت پس اے خود پرست | کہ نقّاش نقشے بباطل ملبست

۳۔ پنبہ دانہ

روزے مشتے ز پنبہ دانہ | دہقاں بہ گرفت و شد زخانہ
ہر دانہ جدا بہر کنارے | بنشاند بخاکِ کشت زارے
دود از دلِ دانہا بر آمد | ہیہات زمانِ ما سر آمد
یک یک برحالِ خویش بگریست | در خاک چگونہ میتواں زیست
فریاد زدند و لب کشودند | پیشِ دہقاں فغاں نمودند
آخر چہ گناہ و جرم دیدی | کز مسکنِ ما بروں کشیدی
بودیم ترا زخانہ زاداں | در گوشۂ کلبۂ تو شاداں
از حضرتِ خود چرا براندی | ویں خاک بہ فرقِ ما فشاندی
گفتا بکشید صبر یک چند | خود ہست کشایشے دریں بند
رازے کہ بدیدہ ام ز آغاز | در قلبِ شما نگنجد آں راز
بعد از دو سہ روز تخم نمناک | بر شکلِ گیا بر آمد از خاک
ہم خاک بفرِ خیش بر داشت | ہم آب بحالِ وے نظر داشت
خورشید بچشمِ لطف دیدش | با ناز و نعیم پروریدش

قرتبہ ۱۸۹۳ء بمقام آگرہ۔

ہم بادِ صبا موافقت کرد ہم ابرِ مطیر سایہ گسترد
بالید بگشت روز تا روز تا گشت نہالِ خاطر افروز۔
بر سر ز شگوفہ زد کلاہے بربست ثمر ز بعدِ ماہے
پس گفت کہ عیش و کامرانی زیں بہ نبود بہ زندگانی
دورانِ بقا مرا بکام ست ایں راحت و خوشدلی تمام است
مصئوں ز غمِ زوال گشتم دانہ بودم نہال گشتم
دہقاں گفتش کہ حرف کم زن زیں مرتبہ پیشتر قدم زن
بسیار سفر ہنوز باقی ست صبحِ تو دمید و روز باقی ست
ہاں باز مکش عنانِ یکراں میزن جرس و فراتر ک راں
مکشائے بہ نیمہ راہ بارت اے چشم براہِ انتظارت
باید عدم و وجود دیدن تلخی و خوشی بسے چشیدن
البتہ بریخت برگ و ہم بار وز حاصلِ پنبہ گشت انبار
بازرگانش بچار سو برد در زیرِ شکنجہ اش بیفشرد
دستہ دستہ بریسمانش بربست و کشید کار وانش
نداف کماں زد و صفا داد در چرخہ بدورِ دیگر افتاد
بودش پسِ ہر نزول معراج تا رفت بکار گاہِ نساج
شد پارچۂ گراں بہائے باریک و نفیس و با صفائے۔

پس جامۂ خوب ازاں بُریدند سلطان و گدا بہ بر کشیدند
گفتا کہ خوش ست صحبتِ من فارغ شدم از نہال بودن
بارے زغرور سرگراں شد غافل زخیالِ امتحاں شد
تا ژندہ و کہنہ گشت و پارہ از کلفت و غم ندید چارہ
در صفِّ نِعال رفتہ از صدر بر مزبلہ ہا فتادہ بے قدر
بازش گرد آورید کنّاس بسپرد بکارگاہِ قرطاس
کاغذ سازاں بہم نشستند تار و پودش زہم گسستند
برہم بزدند و کوفتندش افتاد جدا ز بند بندش
ریشہ ریشہ بہ آب در شد حالا غفلت ز سر بدر شد
میگفت شکیب و صبر باید باشد کہ درِ دگر کشاید
تا جلوہ بہ پیکرِ دگر کرد پیراہنِ کاغذیں بہ بر کرد
پھنا و دراز و با صفا شد کاغذ گشت و ہزار تا شد
راحت ہا دید بعدِ دردے آسودہ گہر بہر نوردے
از ہر علمے و ہر کمالے در وے شدہ مرتسم مثالے
بر صفحہ نگار بست خامہ صد نسخہ ز ہر کتاب و نامہ
جا یافت بمکتب و بدیواں آمد مقبولِ پاک طبعاں
صد بابِ خرد ازاں شدہ باز بکشاد بسے خزینۂ راز

بنمود ز رفتگاں نشانہا | شد بدرقہ بہر کاروانہا
شرحے ز اوامر و نواہی | برخواند بہ بندگانِ شاہی
توقیع شد و مثال و منشور | طومار و صحیفہ ہائے مسطور
ہم آخر کار گشت باطل | از کار شد و نشست عاطل
پس گفت بہ حالتِ تحیّر | دیدم بجہاں بسے تغیّر
قدرت بخشید نفع و سودم | زاں کہ امید بستہ بودم
بودم گلِ تازۂ بہ کشتے | پنداشتہ گشت راہ بہشتے
زاں روز بہر مقام و ہر حال | بردند مرا باوجِ اقبال
تا آنکہ شدم کتابِ پُر مغز | حمّالِ نکات و معنی نغز
اکنوں ہم امیدِ لطف دارم | کز جیبِ خزاں دمد بہارم
القصہ گرفت شعلہ دروے | شد منزلِ آخرینِ او طے

از ساحتِ خاک رخت بربست
بر شد بہ ہوا بمہر پیوست

۴۔ شیر

شیر بگوید کہ منم پادشاہ | نیست مرا حاجتِ تاج و کلاہ
ناخن و سرپنجۂ و دندانِ من | بس بود ایں دبدبۂ شانِ من

بانگ زنم تند چو بر دام و دد | زلزلہ در کوہ و بیاباں فتد
بر سرِ صیدے کہ کنم پنجہ تیز | پوست بدرّم کنمش ریز ریز
چوں بزنم بر سرِ پیلِ دماں | رو بگریز آورد از بیمِ جاں
چوں بشکارے بکشایم کمیں | برقِ جہندہ شوم از خشم و کیں
وائے بر آہو کہ در آید بہ پیش | روئے زمیں افگنمش سینہ ریش
پنجہ زنم در بنِ غارش برم | میکشم و میدرم و می خورم
حیف بریں خوئے تو اے شرزہ شیر | از چہ بخونِ دگرانی دلیر
چونتو نخواہم کہ شوم پادشاہ | پادشہِ ظالم و کم خیر خواہ
پادشہِ مُلک اگر بودمے | بر ہمہ مخلوق بہ بخشودمے
جملہ بخوف اندز آئینِ تو | لب بکشایند بہ نفرینِ تو

جور و جفائے تو شدہ ست آشکار
شاہِ نکو نام نہٖ زنہار

۵۔ خجالت بر گناہ

شہے بود با مہر و عاجز نواز | کہ رفتے بزنداں پئے کشفِ راز
بحالِ اسیراں نظر داشتے | ہم از ماجرا شاں خبر داشتے
جہاندار روزے بزنداں رسید | در آنجائے بد پنج کس تازہ دید

بخواند و زیک یک بپرسید حال
کہ چوں او فتادند اندر وبال

یکے گفت شاہا گناہم نبود
گواہم بنا راستی لب کشود

دوم گفت قاضی عدوے من ست
سوم گفت ظنّے بسوے من ست

چہارم چنیں گفت کاے شہریار
دگرکس خطا کرد و من زیربار

سخن چوں بحجّت بیارا ستند
رہائی زبندِ گراں خواستند

چو نوبت بعاصیِ پنجم فتاد
ز شرمِ گنہ مُہر برلب نہاد

بصد رنج و افسوس گفتا کہ شاہ
یکے کیسۂ زر بدزدیدم آہ!

نگویم کہ ہستم سزاے کرم
بباطل نرفت ایں جفا برسرم

بفرمود سلطاں بداں شرمسار
توئی دزد و اینہا امانت شعار

نباشد بفہم و درایت قریں
بدیں بے گناہاں شوی ہمنشیں

بروز و داز ینجا کہ کردم رہا
تو قابل نۂ صحبتِ نیک را

۶۔ کاخِ ویرانہ

بگشتیم روزے بویرانۂ
کہ بودہ ست ایوانِ شاہانۂ

ندا آمد از تودۂ سنگ و خشت
کہ بودیم وقتے چو خرّم بہشت

مہیّا ز ہر گونہ سازِ نشاط
حریریں سراپردہ قالیں بساط

بزرگانِ با شوکت و ارجمند نشستہ دریں بارگاہِ بلند
بیک ناگہاں گردشِ روزگار ببردہ از چمن رونقِ نو بہار
ز دیّار ایں بقعہ یک تن نماند شب آمد و لے شمعِ روشن نماند
زمانہ چو آں عقد بگسیختہ شد ایں قصر پاشیدہ و ریختہ
زباراں و سرما و از آفتاب بگردید بُنیانِ محکم خراب
بجا ہائے ایوانِ آراستہ گیا رُستہ و خار بُن خاستہ
ز ویرانۂ بزمِ خنیا گراں نمی خیزد الّا نہیقِ خراں
دریغا ازیں کاخِ با فرّ و جاہ کہ بر گردِ آں ایستادے سپاہ
تو گوئی کہ خود طاق و ایواں نداشت نشیمن نبود و شبستاں نداشت
ز دیوار و در ہا نشانے نماند بریں ماجرا نوحہ خوانے نماند
مگر روبہاں مسکنے ساختند شغالاں ہیاہو در انداختند
ازاں کدخدایانِ با نام و ننگ مبیں تودہ ہائے گِل و خشت و سنگ
نکو یادگارے کہ عدل ست و داد ازایشاں ہمی خلق دارد بیاد

۷- ابر و باراں

بسوئے سقفِ نیلی کُن نگاہے کہ آمد لکّۂ ابرِ سیاہے
باندک روز گردد ابر افزوں فرا گیرد فضائے سطحِ گردوں

نقابے افگند بر روئے خورشید | بروز اندر شبِ تارے تواں دید
بغرّد کوسِ رعد و برجہد برق | بریزد آب و صحرا ہا شود غرق
زمینِ تشنہ گردد زود سیراب | کہ راحت ہا رسد بعد از تب و تاب
ببارد از ہوا چوں یک دو باراں | بروید سبزہ اندر مرغزاراں
بگردد زندہ خاکِ مردہ و خشک | بخندد اندر گل و بیروں دہد مشک
وزد بادِ خنک تا غنچہ خندد | سمومِ جانگزا گو رخت بندد
نسیمِ معتدل آید سبک پا | صبا غلتد بروئے فرشِ خضرا
بجوشد آبِ صافی از تگِ چاہ | گیا در کشت بالد حسبِ دلخواہ
شود باراں چو بافر خندہ حالی | نماید پرّ طوطی زرعِ شالی
بہندستاں اگر باراں نہ بارد | زمینِ مزرعہ حاصل نیارد

۸- پیرِ جلّاب و خرش

پیر مردے بود و ہمراہش پسر | سوئے بخا سے ہمے بردند خر
خود پیادہ ہر دو اُفتادہ براہ | خر سبک میرفت و میخوردے گیاہ
آں یکے دید و بگفت ایں ابلہاں | خویشتن در رنج زاہ و خر جہاں
پیر بشنید و چو خر در گل بماند | زود پشتِ خر پسر را بر نشاند
پیشتر رفتند زانجا اندکے | بانگ برزد از کنارِ رہ یکے

ہے چرا شد خر سوارہ ایں پسر / پیر بیچارہ پیادہ رہ سپر

نوجواں آرام و پیرے در تعب / نیست ایں معنی ز ہنجار ادب

پیر چوں ایں طعن و تشنیعہا شنود / طفل را آورد از مرکب فرود

خود بہ پشتِ خر نشستہ شد رواں / طفلِ بیچارہ زپیش و پس دواں

بانگ زد رہ روے کاے پیرِ دوں / برگزیدی از چہ ایں طورِ زبوں

میدوانی طفل و گشتہ استی سوار / تو ز بے مہری نداری ننگ و عار

ایں سخن بشنید چوں پیرِ ضعیف / کرد حالا طفل را با خود ردیف

دیگرے دید و بگفت اے مردِ کار / خر ز آنِ تست یا خود مستعار

پیر گفت آرے خر از ملکِ من ست / گفت نے نے کذبِ تو خود روشن است

چوں خرِ مسکیں کشد بارِ دو مرد / حیف مالک گردش ناید بدرد

می نہ زیبد خر کشد بارِ شما / خر کشی باشد سزاوارِ شما

ایں شنیدہ زود تر زیر آمدند / از سواری ہر دو تن سیر آمدند

خر بہ بستند و کشیدندش بدوش / تا برند آں روے پل بہرِ فروش

ایں تماشا کس ندیدہ در جہاں / مردماں انگشت حیرت در دہاں

پس بدادند از سرِ آں پل عبور / خر ز قید و بند گشتہ ناصبور

دست و پا ہا ز رسن را پارہ کرد / پیر نتوانست ہیچ چارہ کرد

خر بدریا او فتادہ شد تلف / بر زیانش پیر می مالید کف

گفت با خود ایں سزائے آنکہ من
ہر کسے خوشنود خواہم ساختن

ہر کہ میجوید رضائے ہر کسے
در جہاں جور و زیاں بیند بسے

۹۔ چوبکے میان سیلاب

زکوہستان رواں شد سیلِ بیباک
کہ موجش چاک میزد سینۂ خاک

بہ تندی سنگ را بر سنگ سودہ
درختانِ کہن را در ربودہ

میانِ موج او چوبے سبکسار
ہمیرفت و ہمیزد لاف بسیار

کہ میرانم من ایں آبِ رواں را
منم سالارِ خیلِ کارواں را

بنساحل گفت کاے ساحل ندانی
کہ از من سیل را آید روانی

نمی بینی کہ ہست اندر کفِ من
زمامِ رفتن استادن و ویدن

دریں اندیشہ بود آں چوبکِ ہیچ
کہ آب افتاد در راہِ کج و پیچ

رواں بگذشت آب از نائے تنگے
ولے درماند چوبک زیرِ سنگے

بگفتا ہیں مرا بگذار اے سنگ
بگستاخی مزن در دامنم چنگ

کہ جز من آب را یاور کہ باشد
چو من بگذارمش رہبر کہ باشد

منم از راہ و رسمِ منزل آگاہ
مبادا آب بے من گم کند راہ

بگفتا عرض کن در پیشِ ساحل
کہ دریا راست او میرِ مراحل

بگفت و گفت ساحل لب فروبند
کہ بسیارے زدند ایں لاف و رفتند

نہ بے آنہا تفاوت کرد دریا
بسے بردو بسے آورد دریا

نہ از آنہا بدریا در نشان ست
ولے مواجِ دریا ہماں ست

پس از تو ہمچنیں آیند بسیار
روند آخر دریں ورطہ نگونسار

۱۰۔ طفلکے و مادرش

طفلکے بر کنارِ حوض رسید
آبِ صافی درونِ حوض بدید

موجہا دید از وزیدنِ باد
جائے خوش بود خاطرش بکشاد

خواست با سنگریزہا بازد
یک یک آں روئے آب اندازد

نوبتِ اوّلیں کہ دست کشاد
سنگریزہ میانِ آب اُفتاد

در عجب ماندہ از تماشائے
کہ ندیدہ ست پیش ازیں جائے

سنگریزہ کہ خورد ساحتِ آب
دائرہ زد چو ہالۂ مہتاب

رفتہ رفتہ فراخ تر گشتہ
عاقبت غائب از نظر گشتہ

جمع آوردہ سنگریزہ چند
ہم چنیں روئے آب می اُفگند

مادرش کرد ہم بحوض گزر
ماجرا باز گفت با مادر

جنبشے کاں بچشم بے قدرست
اثرش بیں چہا بزرگ ترست

طرفہ نقشے بر آب پیدا کرد
نقطۂ را محیطِ پہنا کرد

گفت مادر کہ ہمچنیں ہر کار
اولش اندک آخرش بسیاز

بس بدیدم کہ کمتریں عملے
کردہ پیدا عظیم تر خللے

اے بسا ذرۂ نکوئی خاست
آفتابے شد و جہاں آراست

جانِ مادر بہ لہو بازی نیز
عبرتے ہست بہرِ اہلِ تمیز

۱۱- آبگیرے و رودے

آبگیرے بہ رودِ ہمسایہ
گفت کاے گرم رو تنک مایہ

بے محابا کہ خرجِ آب کنی
خانۂ خود ہمے خراب کنی

ایں قدر تند میروی شب و روز
ہے اندازی خطر ز حرِّ تموز

زود باشد کہ تیر ماہ رسد
مہرِ تاباں بگرم گاہ رسد

باید آنگہ کشید رنجِ دراز
کابِ رفتہ بجو نیاید باز

رود گفتش جواب از سرِ ہوش
آبگیرا! خموش باش و مجوش

خوش ہمی آیدم رواں بودن
نے بخیلانہ سرگراں بودن

زاں طرف گیرم ایں طرف بدہم
حیف باشد گرش بہ بند نہم

دائما در افاضہ باید بود
مرگ خوشتر کہ زیستن بے سود

عاقبت آفتابِ تیر بتافت
بر سرِ رود و آبگیر بتافت

تا نشانے زآبگیر نماند   رودِ فیاض ہمچناں میراند
سبزہ و گلُ دمیدہ اطرافش   شکرگویاں زعینِ الطافش

مست و محوِ صدائے آب شدہ
ایمن از تابِ آفتاب شدہ

۱۲- دو جوے

دو جو گشتہ از کوہسارے رواں   بوادیِ زیریں پئے ہم دواں
یکے خامش و سست و کم آب تر   دگر تند و موّاج و بیتاب تر
بگفت ایں بداں لے کہ سستی کنی   کجا کارِ خود با درستی کنی
بدیں کاہلی تا کہ تو می روی   بترسم کہ در خاکِ رہ گم شوی
ازیں بیش کائی بپہلوے من   سفینہ تردد کند روئے من
بہر گوشہ دولت فشاں بگزرم   خرامے بدریاے اعظم برم
تو می باش قانع زروئے نیاز   فراتر روم من براہِ دراز
ولے جوے خاموش پاسخ نداد   بہ آہستگی سر بصحرا نہاد
ہر آں جوئے کوچک کہ در راہ دید   بہمراہیِ خود ورا بر گزید
ہمی رفت تا گشت پہن و طویل   چو جیحون و سیحون و دریائے نیل
زہر جانبے جُست با خود رفیق   تواضع نمودش وسیع و عمیق

ولے جوئے مغرور برعکس آں | بہ تنہا خراسید دامن کشاں
بجوہائے دیگر نکرد التفات | فراہم بیاورد آب ازجہات
بہ آخر دراں رود مدخل بجست | کہ کم مایہ سیدیدش اندر نخست

۱۳۔ کشفے وخرگوشے

مثلے گویم ارکنی درگوش | کشفے گوئے بردہ ازخرگوش
سبک ازجائے خود بروں جستند | بدویدن ہمے کمر بستند
دور تر نقطۂ نشاں دادہ | رو بآں نقطہ ہر دو اُفتادہ
کشف آہستہ تر قدم بہ قدم | بے درنگے ہمے رود پیہم
باز خرگوش تند گشتہ رواں | تیز تر ہم چو باد و برق دواں
سیر و گردش کناں یمین و یسار | باز گردیدہ برخطِ رفتار
یک دو میداں دویدہ در نفسے | خویشتن را ہمے ستودہ بسے
خندہ بر سستیٔ حریف زدہ | طعن و تشنیع بر ضعیف زدہ
چوں حریفش بگردِ او نرسید | پا ز رفتار باز پس بکشید
گفت چہ لا دمے بیا سایم | خود چرا زود راہ پیمایم
ہمہ راہ و روش بداد از یاد | دیدہ بربست و سر بخواب نہاد
سنگ پشت از عقب رسید و گذشت | خفتہ خرگوش را بدید و گذشت

زہ بریدہ بزحمت بسیار — پیشتر آمدہ بجائے قرار
خود بدانید تاکہ بُردو کہ باخت — رخش فرزانگی بباید تاخت

۱۴- طاؤس

نہ بینی کہ طاؤس گردن فراز — کشاید ہمے بال و پرہا بناز
ز قوسِ قزح رنگہایش فزوں — تو گوئی کہ از جنّت آمد بروں
ولے بانگِ ناخوش کند متصل — چو شب بشنوم ہولم آید بدل
سخن برگزیدم ازیں جانور — کہ دانش بہ است از قبا ہائے زر
شرف آدمی را نہ بخشد لباس — چہ دیبائے مُعلم چہ کہنہ پلاس
برو از ادب جامہ ترتیب کُن — ترقی بہ تکمیل و تہذیب کُن
ز خود بینی و عجب و کبر و غرور — نہ راحت میسر شود نے سرور
مبادا ایں کہ من نیز طاؤس وار — بر عنائیِ خود کنم افتخار
مرا زیب و زینت ہمیں قدر بس — کہ یاراں کنند آفریں یک نفس

۱۵- شیر و موشے

موشکے در حضورِ شیر افتاد — شیر از بہرِ صید پنجہ کشاد
گفت از روئے عجز موشِ ذلیل — اے شہِ با وقار شیرِ جلیل

نتوانم رسانمت آزار | کمتریں بندہ ام مرا بگذار
گر رود التفات بر سخنم | گاہ باشد کہ خدمتے بکنم
شیر را عجزِ وے پسند آمد | رحم بر حالِ مستمند آمد
پس اماں جوئے را اماں بخشید | مردمی کرد و پنجہ باز کشید
شد بریں قصہ چند روزے دیر | تا گرفتارِ دام شد آں شیر
دام زاں گونہ بر تنش پیچید | کہ بنوعے رہِ خلاص نہ دید
لاجرم شیر آہ و زاری کرد | موش بشنید و عزمِ یاری کرد
کہ مبادا رسد گزند و زیاں | بکشندش گروہِ آدمیاں
آمد و خاد مانہ داد سلام | پس بدنداں برید رشتۂ دام
رخنۂ زد فراخ و کار بساخت | بند بگسست و شیر بیروں تاخت

۱۶۔ سگے

بدریا سگے استخواں در دہاں | شنا کرد و از عکس شد در گماں
کہ دارد سگے استخواں زیرِ آب | چو من در شناسی نماید شتاب
بہ بیداں تماشا و از روئے آز | فرو شد بآب و دہن کرد باز
کہ تا در رباید ز سگ استخواں | و لے از سگ و استخواں کو نشاں
خود آں استخوانش تہِ آب شد | خجل باز گردید و بے تاب شد

بدل میدہد مردِ طامع قرار — بگیر آں دگر ایں یکے را بدار
ولے آں رود ایں نیاید بکف — طمع میکند ایں وآں را تلف
غنیمت شمار انچہ آمد بدست — خوش آں کو بکنجِ قناعت نشست
بکار آورش انچہ دریافتی — خزف یافتی ور گہر یافتی

۱۷- گرگے

گرگے لبِ جوئے رفت و شد سیر — می خورد برہ بجانبِ زیر
تا خواست کہ حیلہ پیش آرد — وانگاہ گلوئے او فشارد
دیدش بنگاہِ خشم آلود — کاے برۂ نابکار و مردود
شرمت ناید ازیں و تیرہ — کردی ہمہ آب خورد تیرہ
گفتا بہ ادب جنابِ والا — من زیر ترم شما بالا
بالا رود آب کے ز پستی — برمن مکنید چیرہ دستی
چوں گرگ بحجتش فرو ماند — شرمندہ بہ پہلوے دگر راند
ہاں! پار کہ یادِ من نمودی — دشنامِ غلیظ دادہ بودی
ایں بار اگر خطا نہفتی — ہاں پار بدم چرا بگفتی؟
گفتا ہے ہے! انیم خطا کار — شش ماہہ چہ بد بگویدت پار
من پار کہ خود نزادہ بودم — دشنام چگونہ دادہ بودم

زمیں گو نہ کہ حجتِ قوی گفت | گرگ از سرِ خیرگی بر آشفت
گفتا تو اگر نگفتۂ بد | شاید پدرِ تو گفتہ باشد
ایں گفت و بکشت و خورد او را | حجّت نہ برد بدیِ خور را

۱۸۔ محمود غزنوی

بگویند محمودِ فرخندہ خو | بہ طفلی بیار است باغ نکو
بہ پرداخت بستاں سرائے عجیب | کہ بینندہ را بردے از دل شکیب
پدر را یکے روز مہماں بخواند | ز بہرِ تماشائے ایواں بخواند
برفت و بدید و پسندید و گفت | کہ اے ملک و دولت ترا باد جفت
بدیں خانہ زیبد کنی فخر و ناز | چرا بر مگسہا زند شاہباز
چنیں کوشک و روضۂ دلپذیر | تواند بنا کرد ہر یک امیر
تو پیرائے باغے بسرو سمن | کہ مشکل تواں مثلِ آں ساختن
تو آں قصرِ خرّم بنا کن بہ دہر | کزاں عاجز آیند میرانِ شہر
بپرسید آخر کدام است آں | منم بندہ فرمانِ شاہِ زماں
بگفتا کہ آں روضۂ خوش ثمر | دلِ اہلِ علم است و اہلِ ہنر
تو گر علم و فضل و ہنر پروری | در اقصائے عالم کنی سروری
پدر ہر چہ از نصح گوہر فشاند | بر آں بود محمود تا ملک راند

عطا داد و بنواخت اہلِ ہنر
در آفاق شد نامِ نیکش سمر

خردمند مردم ز ہر مرز و بوم
در آوردہ پائے سریرش ہجوم

شد القصہ غزنیں عروس البلاد
دراں بود از ہر فنے اوستاد

نہ سلطاں بماند و نہ سلطا نیش
مگر قصہائے جہانبانیش

۱۹- بیرام و قاسم

چو اقبال رو از ہمایوں بتافت
ز ہندوستاں سوے ایراں شتافت

پریشاں شدش کار و ساماں تباہ
فرو کوفت طبلِ شہی شیر شاہ

پراگندہ گشتند یارانِ او
مگر جمعے از جاں نثاران او

خیالِ رفاقت بسر داشتند
پئے شاہِ معزول بر داشتند

ازاں جملہ بیرام و قاسم دو مرد
کہ بودند در وضعِ اخلاص فرد

بر آقاے دیرینہ دل شاں طپید
وفا ہمچو پیکاں بہ پہلو خلید

شبے راست کردند عزمِ گریز
نشستند بر بارگیہائے تیز

جدا گشتہ از مخیمِ شیر شاہ
بایراں زمیں باز جستند راہ

ولے بیمہ رہ شیر شاہی سفیر
نمود ایں گریزندگاں را اسیر

چو قاسم نکو فربہ اندام بود
بصورت قوی تر ز بیرام بود

گماں برد بیرام و بندش نہاد
بروں جست بیرام چوں برق و باد

ولے کرد اندیشہ دریں راہ — کہ نبود بمردی بتر زیں گناہ
کہ یارے شود فدیۂ خونِ من — تفو بر من و ہمّتِ دونِ من
پشیماں شد و شرمگیں از فرار — عناں باز پیچید و گفت آشکار
منم خانِ بیرام اے مرد ماں — نہ آں مردِ بیچارۂ خستہ جاں
خدارا ازبندش رہائی دہید — ہماں بند بر دست و پایم نہید
چو قاسم دلیریِ بیرام دید — بہ احوالِ او لب بدنداں گزید
چرا آمد ایں یارِ بگریختہ — مبادا کہ خونش شود ریختہ
گر ایں بازِ پرّاں در افتد بدام — مرا جانِ شیریں شود تلخ کام
نمودند بارے از و کشفِ راز — کہ از رازِ سربستہ برگوئے باز
بگفتا کہ ایں خادمِ باوفا — نخواہد کہ بر من بہ بیند جفا
دلش سوخت بر حالتِ زارِ من — کہ بودست وقتے نمکخوارِ من
ز روے وفاداری آمد دواں — کہ تا فدیۂ من شود ایں جواں
وگرنہ منم خانِ بیرام و بس — نجویم رہائی بہ امدادِ کس
دریں طرفہ دعویِ مرد آزمائے — پژوہندہ را خیرہ شد عقل و رائے
مگر قولِ بیرام باور نداشت — نہ ایں را گرفت و نہ آں را گذاشت
ز جاں رفت قاسم دریں داوری — فرو ماند بیرام از یاوری
بزرگاں کہ برتر نشیں بودہ اند — براہِ فتوّت چنیں بودہ اند

۲۰۔ اورنگ زیب

بگویند سلطان اورنگ زیب
کہ مردانہ خو بود و صاحب شکیب

در ایامِ شہزادگی ناگہاں
بہ پیش آمدش مست پیلے دماں

دواں درپیش پیلباں نعرہ زن
اَلا اَمردماں پیلِ مردم فگن

زہولش ہیا ہو بمردم فتاد
پریدند چوں برگ از تُندِ باد

بکنجے فرار فت ہر کس کہ بود
کہ با دیو پیکار نتواں نمود

ولے شاہزادہ بیفشرد گام
بہیبت برآورد تیغ از نیام

چناں زد بخرطومِ آں ژندہ پیل
کہ مستیِ او شد بہُش مستحیل

بلرزید از زخمِ ضربِ درشت
برآورد فریاد و بنمود پشت

ہم از منظرے دید شاہِ جہاں
دلیریِ شہزادۂ نوجواں

بخواند و بگفتش کہ جانِ پدر
تہوّر نہ نیکوست با جانور

نہ از عقل باشد کہ با پیلِ مست
درافتی و شمشیر تنہا بدست

زروے ادب گفت کلّے شہریار
خدایم نداد ست پائے فرار

مرا نیز شاہا چنیں ست رائے
ولے پائے ہمّت نہ جنبد ز جائے

بپائے کہ جویم ز میداں گریز
مگر قطع باد ابشمشیر تیز

۲۱- روباہے بے دُم

روبہے در دامِ صیادے فتاد | جاں بِبُرد و گفت دُم را خیرباد
چند روزے در غمِ دُم خستہ بود | زانکہ بر زیبائیش دل بستہ بود
برگزیدہ خلوتے با درد و سوز | نے بشب بیروں خرامیدے نہ روز
جوع زور آورد تا پایانِ کار | شد ز کنجِ خانہ با صد اضطرار
زندہ را گر دُم نباشد گو مباش | لیک نتواں زیست بے وجہِ معاش
اندکے خورد و ز جورِ فاقہ رست | پس خیالِ باطلے در دل بہ بست
گفت با خود بایدم افسوں دمید | وز غم و اندُہ بحیلت وا رہید
بانگ بر زد کرد دعوت قوم را | ہاں بیائید اے عزیزاں الصّلا!
روبہاں گرد آمدند از ہر کنار | ہم ز ہند و سند و از بنگ و بہار
شکر گفت و رفت بر جائے بلند | گفت دارم با شما ہا حرفِ چند
بسکہ دُم را دوست دارد قومِ ما | ہست ایں رسمِ قبیح و ناسزا
گر سلف دلدادۂ دُم بودہ اند | خود ز رُشد و راستی گم بودہ اند
من نگویم پند از روئے قیاس | ہست برہانِ قوی آں را اساس
امتحاں را دُم زتن انداختم | بہرِ نفعِ قوم بازی باختم
تا ز دُم فارغ نشستم در جہاں | راحتے دیدم کہ ناید در بیاں

بے دمی عیشے ست بے مثل و نظیر | بر شما اظہار کردم ناگزیر
ہر کہ دارد عقلِ صالح در دماغ | بایدش جستن زبارِ دم فراغ
ہدیہ از حکمت آوردم بکف | گر قبول افتد زہے عز و شرف
روبہے گفت از میانِ انجمن | ہست افسوں ایہا القوم ایں سخن
ناصح ما باز اگر دم یافتے | زیں مواعظ بیشِ ما کم بافتے
ایں ہمہ مکر و فن و حیلت گری ست | عصمتِ بی بی ہم از بے چادری ست

۲۲- باد و آفتاب

باد با آفتاب عربدہ جست | کہ زما ہر دو کیست چابک و چست
کیست پُرفن کدام بے ہنر ست | از من و تو کہ زورمند تر ست
باید از بہرِ امتحاں محکے | تا نماند دگر مجالِ شکے
در بیاباں مسافرے دیدند | از برائے نشانہ بگزیدند
شرط کردند تا بقوتِ خویش | بکند ہر کہ جامۂ درویش
ورنہ بیہودہ ژاژ کم خاید | لب بدعویٰ فضل بکشاید
بادِ صحرا بداں غریب آویخت | صرصرِ تند گشت و گرد انگیخت
مرد چوں موجِ تیزِ صرصر دید | دامن و آستیں بسک برچید
بہ بر و دوش چست کرد عبا | گشت ایمن ز صرصر و ز صبا

باد چنداں کہ شور و شر افگند | نتوانست جامہ اش بر کند
رفت چوں جد و جہد باد بہ باد | سر بصحرا نہاد و باز استاد
آفتاب آمدہ بہ نوبتِ کار | کرد آغازِ تافتن بہ وقار
اندک اندک حرارتے افزود | مرد ناچار بندِ جامہ کشود
از بنِ موئے خوے بجوش آمد | تا عبایش وبالِ دوش آمد
پس بخود تابِ آفتاب نیافت | جامہ افگند و زیرِ سایہ شتافت
بعد ازاں آفتاب باتب و تاب | نیز با بادِ تند کرد خطاب
کہ بآہستگی برآید کام | نہ بہ تندی و تیزی و ابرام

۲۳۔ گوزنے

گوزنے تشنہ از سوئے بیاباں | کنارِ جوئے باز آمد شتاباں
بخورد آب و میانش روئے خود دید | نظر بر شاخہا کرد و بنازید
کہ دارم شاخہائے بس دلآویز | بلند و استوار و سخت و سر تیز
مرا اے کاش بودے جملہ اعضا | بسانِ شاخہایم خوب و زیبا
منم از شاخہا سر خیلِ حیواں | ولے پاہا مرا کردہ پشیماں
چناں لاغر کہ بارِ تن کشیدن | بود دشوار ہنگامِ دویدن
مرا انداخت پاہایم بزشتی | وگرنہ ہستم آہوئے بہشتی

بیک ناگہ سگاں کردند آواز
شنید و کرد آغازِ تگ و تاز

سبک برجست و حالا کرد باور
کہ عضوے نیست جز پاہاش یاور

ولیکن زود شاخ دلپسندش
نمودہ مبتلائے قید و بندش

بہ پیچیدند در شاخِ درختے
فرو ماند اندریں خلجان لختے

تگاپو را در نگ افتاد چنداں
گرفتندش سگانِ تیز دنداں

دواں آمد ز پس صیادِ خوشدل
بکردش زود تر با دشنہ بسمل

بسا چیزے کہ در چشمت بد آید
ولے آخر درِ شادی کشاید

بسا چیزے کہ آنرا دوست داری
کہ پایانش نہ بینی غیر خواری

بسا کسہا کہ پنداریش ناکس
بر د گوئے سعادت از بساکس

۲۴- بدی و نیکی

بباید ازیں سہ بگریزی بجد
فکرِ بد و قولِ بد و فعلِ بد

فکرِ بد و زشت کہ در دل بود
آں بمثل زہر ہلاہل بود

زہر کہ ماند بدرونت مقیم
تا چہ دہد؟ جز کہ زیانِ عظیم

زخم زند گر سگِ دیوانۂ
یا بگزد مار بہ ویرانۂ

بہ کہ بدل فکر بدے جا کند
دغدغہ در جانِ تو پیدا کند

دیو کمیں کردہ تو چالاک باش
ساحتِ دل پاک کن و پاک باش

چوں زِ افکارِ بد آزادگی | تا بتوانی مکن افتادگی
جہد کن و جنگِ دلیرانہ کن | تا بکنی فکرِ بد از بیخ و بن
قولِ بد آید ہمہ از فکرِ زشت | این پدرست آں پسرِ بدسرشت
خبثِ دروں زشتیِ گفتار شد | موجبِ صد کلفت و آزار شد
از درِ گوش آمد و در دل خزید | مارِ سیاہےست کہ جاں را گزید
با ہمہ نیرو کہ تو داری بکوش | تا سخنِ بد نہ در آید بگوش
ہاں بہ بد و نیک بکن امتیاز | چند نشینی سرِ بول و براز
پس بہ یقیں صورتِ کردارِ بد | ہست ز فکرِ بد و گفتارِ بد
فکرِ بد از دل چو بروں داشتی | با تو زباں نیز کند آشتی
قلب و زبانت چو بود در پناہ | دست نجنبد بہ بدی ہیچگاہ
وسوسۂ بد کہ فرو شد بہ دل | زود بروں کن بدرونش مہل
شعلۂ اول کہ بکشتی بہ فن | خانہ نگہداشتی از سوختن
ہر کہ دلش را ز پلیدی بشست | خود ہمہ کردارِ وی آید درست
جنبشِ نیکو کہ ز دل خاستہ است | صورتِ افعال بیاراستہ است

ہر عملِ خیر کہ آید ز تو
نیست مگر زادۂ فکرِ نکو

دورِ آخر

وقتیکہ استماعِ حادثۂ ہائلۂ رحلت فرمودن جناب وقبلہ مرشدنا ومولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی
کہ بروز دوشنبہ بست وششم شہر ربیع الاولی ۱۲۹۷ھ ہجری مطابق ششم ماہ مارچ ۱۸۸۰ء
بوقوع پیوستہ سامعہ سوز یاران طریقت گردید خاصہ منشی نجم الدین دہلوی (رحمۃ اللہ تعالےٰ) را
دامنِ شکیب از دست رفتہ بود ودل بگرداب اضطراب افتادہ وجوئے اشک از چشمہائے
چشم کشادہ باین خاکسار ایمائے رفت تا بیتے چند بانداز مثنوی رنگ تسوید پذیرفتہ
دراں ایّام خواندن وشنیدنِ آن موجب مشغولی طبایع محزون ودلہاے پرخون شد۔
اسمٰعیل

اے نسیمِ صبحِ ایّامِ بہار
در حریمِ کعبۂ جاں کن گزار

روئے خود برخاکِ پانی پت بسائے
شمّۂ احوالِ آنجا برکشائے

فصلی از غوغای محشر کن بیاں
کوسِ رحلت کوفت آں شاہِ شہاں

غوثِ ما را وقتِ رحلت در رسید
رفت در غیب آں شہنشاہِ رشید

شاہبازِ قدس پرّید از چمن
شد نور دیدہ بساطِ انجمن

بازگو از زائرانِ کوے او
بازگو از بیدلانِ روے او

بازگو رمزے ازاں دریاے راز
موجۂ دریا بدریا رفت باز

کن حدیثِ بحرِ ناپید اکنار
بازگو زاں موجہاے نوربار

بازگو از بزمِ آں شاہِ وحید
شہ سوارِ فردو سلطانِ مجید

اے تو خوانِ غیب را خوش میزباں
اے تو خضرِ راہِ مالم گشتگاں

اے جہانِ معرفت را آفتاب — از رخِ روشن بر افگندی نقاب
در نگر آوارگانِ خویش را — چارہ کن بیچارگانِ خویش را
گوشۂ چشمی بمہجوراں بکن — یک نگہ بر حالتِ دوراں بکن
بشنو اے سلطانِ ایوانِ بلند — مرد و زن ہا آہ و زاری میکنند
ہے چہ گفتم از غم و بگریستن — ہست وہم این مردن و این زیستن
تو بری از اقتران و افتراق — از خیالات است این ہجر و فراق
وہم ہستی شد مجالِ اشتیاق — ہیچ باشد ماتم درد و فراق
بلبل و گل ہیچ و بستاں نیز ہم — ذوق و شوق و علم و عرفاں نیز ہم
جذر و مدِ بحر و ہم موج و حباب — گر بسنجی جملہ یک آب ست آب
وسوسہ بگذار بحر و موج کو — بی نشانی را حضیض و اوج کو
موج خواند قصۂ ہجر و وصال — بحر مستغنی ست از نقص و کمال
بحر اگر ساکن بود امواج لاست — بی تموّج بحر را اشر ے کجاست
جوششی زد بحر و موج آمد پدید — شد نمایاں آں قدیم اندر جدید
جوش و بحر و موج میخوانیش نام — ورنہ یک ہستی است بیروں از کلام
نیست مردانِ خدا را ہیچ بند — برتر ست از جسم و جاں بیچون و چند
مردگاں را خوف مردن در خورست — زندگاں را مرگ تن جاں پرورست
زندہ را ممتنع باشد ممات — مردہ را خود روا نبود حیات

این حیات و این ممات از شرک ہست | وحدتِ مطلق بود در خویش مست
آنکه او زنده است حی و قائم است | لایموت و لایزال و دائم ست
دائم ست و قائم ست و زنده است | لایزال و لم یزل پائیده است
زندگیِ بے نہایت بے زوال | برتر آمد از تگاپوے خیال
خود تو بودی خود تو باشی تا دوام | لے بروں از گفتگو ہا و کلام
تو دُرِ دریاے وحدت بودۂ | ہم چنانکہ بودۂ آسودۂ
جانِ تو خود جانِ جانِ زندگی ست | از تو خرم بوستانِ زندگی ست
سالہا گردیدۂ در بحر و بر | ہم تو خود مقصود بودی از سفر
سالہا ارشاد را بردی بکار | ہم تو خود صیاد بودی خود شکار
از بروں در بگفتی ما و من | وز دروں خود گوش بودی خود سخن
از حقائق و ز معارف و ز یقیں | نغز تر گفتی بوقتِ واپسیں

چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فرد آئی در خلا و در ملا"

بحرِ توحیدِ الٰہی خود توئی | بے تعیّن بے تشخّص بے دوئی
مستیٔ صہباے تو چوں جوش زد | کے شود شورِ من و تو گوش زد
بیخودی بزمِ خودی آراستہ است | نعرہ ہا از خاموشی برخاستہ است
اے ندیم الشمس نجم الدین بیا | نعرۂ دیگر بزن لب بر کشا

نعرۂ دیگر بزن ای نجمِ دین | ہائے وہوئے تست معنی آفریں
دیدہ چوں بر دیدِ تو شیدا شود | در درونِ بحر رہ پیدا شود
کاروانِ بحر در شب ہائے تار | برکفت بنہد زمامِ اختیار
باز بنشیں در خراباتِ سخن | معنی اندر شیشۂ الفاظ کن
باز گو حرفے ز سلطانِ جلیل | تا نہ گردد قصۂ ہجراں طویل
اے درخشاں کوکبِ نورِ قدیم | از کجا جوئیم انفاسِ کریم
از کجا جوئیم آں شام و سحر | چوں فتد در حضرتِ پاکت گذر
از کجا جوئیم گلبانگِ سرور | از کجا یابیم آں انس و حضور
از کجا جوئیم قربِ اختصاص | اے درِ تو قبلہ گاہِ عام و خاص
از کجا جوئیم آں خوش حال ہا | کز دلِ پاکت بروں زد سالہا
پرتوِ حالِ خوشت چوں سر زند | مرغِ اندوہ و الم کے پر زند
پرتوِ حالِ خوشت چوں کوہسار | ہست در عرصاتِ جاں بایک قرار
حسرت و اندوہ زاید از خیال | نے بہ پیشِ پرتوِ خورشید حال
پرتوِ حالِ تو پاک از بیش و کم | تاخت بیروں از وجود و از عدم
پرتوِ حالِ تو پاک از نیک و بد | برزدہ نقشِ ازل را برابد
پرتوِ حالِ تو پاک ست از عمل | استوار و پائدار و بے خلل
پرتوِ حالِ تو پاک از فہمِ عام | ہست لاشرقی و لاغربی مدام

پرتوِ حالِ تو اے سلطانِ حال — ہست بالاتر ز پروازِ خیال
ذاتِ تو پاک ست از حال و مقام — شہپرِ عنقاے تو بشکست دام
کشفِ ہر حالے ز تو یابد کشود — ہر مقامے از تو میگیرد وجود
نقدِ حالِ تست ذاتِ پاکِ تو — ذاتِ پاکِ تست دراداکِ تو
درمیانِ گردشِ لیل و نہار — ہم چو تو کم دیدہ باشد روزگار
خضرِ ربّانی و فردِ کاملے — عارفِ بے باک و مردِ کاملے
پاک و بے باک و مجرّد از علل — شاہبازِ اوجِ افلاکِ ازل
زندۂ جاوید و پاک از جسم و جاں — شہ سوارِ عرصہ ہاے بے نشاں
بی نشانی را نشاں اور تو ئی — ہم شناسا و شناسا گر توئی
بے نشانی را نشاں آمد ز تو — بحر و کاں گوہر فشاں آمد ز تو
لا و اِلّا ہر دو ہیت چیست لا — ما و تو گم گشت باقی کیست لا
ہر چہ میگوئیم قولِ ماست ایں — گفتگو ہا محو شد دریاست ایں
محو را ہم محو کن اے چارہ ساز — ہست فرق از بے نیازی تا نیاز
نیست جاے گفت و تشبیہ و مثال — لیس شئی مثلہ کم کن خیال
گر بگویم ورنہ گویم شانِ تست — ہم خیال و بے خیالی آن تست
اے بری از مرگ و ہم از زندگی — نے خدائی زیبدت نے بندگی
ہم خداے بندگانی اے خدا — بندہ ہستی یا خدا یا خود جدا

خود جدائی خود توصلی خود توئی — اے منزّہ از یکی و از دوئی
اے بری از حدّ اعداد و شمار — با وجودت نیست کس را اعتبار
با وجودت نیست چیزے معتبر — عقل تیرہ گشت و خیرہ شد نظر
ہم چو کافر بایدم بت خانۂ — تا ز تو گویم بتو افسانۂ
خویش را ثابت کنم تا خوانمت — سر بنادانی دہم تا دانمت
بت تراشم گر ترا یاد آورم — آذرم من گر ترا طاعت برم
کافرم من گر ترا آرم سجود — من چہ باشم تا نہم خود را وجود
دامن از گردِ حدوث افشاندۂ — در جہانِ غیب مرکب راندۂ
کشورِ تن را فرو بگذاشتی — آئینہ از پیشِ ما برداشتی
گفتگو ہا از پسِ آئینہ بود — گفتگو را غیر ازیں آئیں نہ بود
گفتگو برجاست ناگر دیدہ فوت — لیک بیروں از لباسِ حرف و صوت
پردۂ صورت ز رواندا ختی — معنیِ معنی نمایاں ساختی
جانِ جاں بودی و جانِ جاں شدی — ہر چہ بودی ہر چہ ہستی آں شدی
بر شکستی ساغر و مینائے ما — اے غنی الطبع بے پروائے ما
بزمِ اُنسِ بیدلاں برہم زدی — پشتِ پا بر ہستیِ عالم زدی
بزمِ اُنسِ بیدلاں دادی بباد — اے ز رویت انجمن خالی مباد
اے ز تو خالی مباد اجائے تو — منظرِ حق روئے جاں افزائے تو

اے دریغا کاروانِ شہرِ جاں رخت بربست و بزد طبلِ گراں
اے دریغا روزگارِ وصل شد جلوۂ کردو بہارِ وصل شد
اے امیرالشرق نجم الدین بیا نعرہ میزن شورمے کن بے ندا
مشرقِ جان و دلِ پیراں ماست بے سروسامانیت سامانِ ماست
نعرۂ تو دل بجنباند ہمے شورِ تو جانہا بشوراند ہمے
ہمتِ والا بما ہمراہ کن رو بسوے بارگاہِ شاہ کن
شاہِ ما پاکست از مرگ و ہلاک گر فنا گردد دو عالم نیست باک
زندگی و مرگ نبود جز فریب نیست کس را سود و سرمایہ نصیب
ہر کہ دارد مایۂ بے مایہ اوست وانکہ اندر فقر شد بے سایہ اوست
ہر کہ جاں داری کند بے جاں تر ست وانکہ ساماں یافت بے ساماں تر ست
سود و سرمایہ خیالے بیش نیست مایۂ درویش جز درویش نیست
نقدِ درویشاں تہی دستی بود دستمزدِ شاں ہمیں مستی بود
چیست گنجِ خوش دلی کیسہ تہی اصلِ دانش نابود نا آگہی
ہستیِ مطلق سراسر نیستی ست اصلِ ہستی نیستی در نیستی ست
زندگی را ترکِ جاں بخشد وجود خود تو ئی گر بے خودی گیرد نمود
بیخودی و باخودی ہم نارواست بے نشانی حضرتِ سلطانِ ماست
حضرتِ سلطاں نگردد بیش و کم نے مثالش نے وجودش نے عدم

حضرتِ سلطاں ندارد ما سوا ‌‌ راست بر جائے خود است ایں ماجرا
حضرتِ سلطاں بسوئیش بانقیت ‌‌ سالکانش را سرو دستار نیست
حضرتِ سلطاں ئے گنجد بگفت ‌‌ در سخن کس دُرِّ ایں معنی نسفت
من ندانم حضرتِ سلطاں کجاست ‌‌ دل کجا و تن کجا و جاں کجاست
حضرتِ سلطاں ندارد بوئے غیر ‌‌ ہست خود بزگرد خود در دور و سیر
حضرتِ سلطاں چہ باشد لب ببند ‌‌ قاصر آمد نرد با نہا و کمند
ہوش را بفروش و حیرت وام کُن ‌‌ قطرۂ از بے خودی در جام کُن
باکہ گویم کُن تو خود کن یا مکن ‌‌ اعتبارِ قطرہ در دریا مکن
قطرہ گشتی و سوئے دریا شدی ‌‌ راہ بنمودی و رہ پیما شدی
قطرگی گم گشت دریا موج زد ‌‌ وہم ہستی محو شد بر اوج زد
وہم را بشکن کہ بر خیزد دوئی ‌‌ تا توئی گردے بر انگیزد دوئی
از دو بینی ہست ایں مرگ و ہلاک ‌‌ حضرتِ سلطانِ ما پاک ست پاک
پاک را کے مرگ آید در خیال ‌‌ زندہ را مردن بود امرِ محال
وصلِ او دائم بود با زندگی ‌‌ ذاتِ او را زندہ گو یا زندگی
زندۂ را حلقۂ ماتم چرا است ‌‌ از پئے گنج مسرت غم چرا است
زندۂ در زندگی بے پردہ شد ‌‌ مردگاں را دل چرا آزردہ شد
زندہ را بزمِ طرب آراستند ‌‌ مردگاں بہرِ عزا برخاستند

زنده گرد از دامنِ جاں برفشاند | مردگاں را صبر و آرامش نماند
مرده آں باشد که وہمش زندگی ست | پیشِ وہمِ خویش اندر بندگی ست
مرده پندارد که ما خود زنده ایم | زندگی را لائق و ارزنده ایم
زنده آں باشد که از ہستی برست | نیست اندر نیست اندر نیست ست
زنده آں باشد که مردن جانِ اوست | خانه ویراں ساختن سامانِ اوست
زنده آں باشد که بالِ جاں کشاد | نیست گشت و محو گشت و نامراد
زنده آں باشد که پیش از مرگ مرد | مرده گشت و تن به بحرِ جاں سپرد
مرگِ او جاں داد و جانش زنده شد | در جہانِ خوشدلی تا زنده شد
او ز وہمِ زندگی آگاه نیست | مرگ را ہم سوئے ذاتش راه نیست
شمسِ ربانی توئی اے نجمِ دیں | بر فرازِ منبرِ جاں بر نشیں
ہاں بیا و نعرهٔ دیگر بزن | خامشیِ بست سرِ جوشِ سخن
ہوش را بر درگہِ شه کن نثار | ہائے ہوئے برفگن دیوانه وار
من کجا بودم تو خود بودی مدام | تہمتے بر بافتی از ننگ و نام
طوقِ ما کردی ز نیکی و بدی | راه بنمودی و راهِ ما زدی
مرده گشتم تا مرادی حیات | گم شدم چوں یافتم راهِ نجات
از دمِ پر عشوه ہا و پر فریب | بے سبب کردی تو مارا ناشکیب
اتحادِ تو مرا بیگانه ساخت | عقل و ہوشِ تو مرا دیوانه ساخت

از نزولِ فراتِ تو پست آمدم | تو کشیدی جام و من مست آمدم
خوے آزادِ تو در دامم کشید | تو شدی پنہاں مرا کردی پدید
از غنائے تو شدم من مستمند | علم تو مارا بنادانی فگند
وصلِ تو مارا بہ ہجراں در سپرد | حی و قائم تو شدی ما خورد و مرد
عدلِ تو مارا بظلم آگند و جہل | مشکلِ ما جملہ پیشِ تست سہل
تا تو کردی خندہ من گریاں شدم | تو شدی روپوش و من عریاں شدم
تو بیا سودی شدم من پائمال | من بہ ہجر افتادم و تو در وصال
من شدم سرگشتہ تو برجاستے | من شدم تنہا تو بزم آراستے
تو گرفتی جاے و من رفتم زجائے | سرکشیدی تو من اُفتادم زپائے
تو شدی گنجے و من ویرانہ ام | عقلِ کُلِ ہستی تو من دیوانہ ام
تو خدا میدی و من رفتم زدست | تو شدی بت آفریں من بت پرست
تو ز من گشتی و من گشتم ز تو | تو ز من بگذر کہ بگذشتم ز تو
گر نماند ایں من و تو درمیاں | نے ترا سود ست نے مارا زیاں
چوں تو خود ہستی ہمیری زینہار | نیستم من پس کجا گیرم قرار
بجمِ دیں اے مطلعِ انوارِ جاں | نعرۂ دیگر بزن بے ایں و آں
خود مخاطب باش و خود میکن خطاب | خود توئی اصلِ سوال و ہم جواب
خود بخود با خود بکن گفت و شنید | نعرۂ از قعرِ جاں باید کشید

رمزِ خود بیخویشتن آغاز کن | نعرہ ہائے بے سرو بن ساز کن
آنچہ ناید بر زباں گفتارِ تست | آنچہ مخفی ماند آں اظہارِ تست
من نگویم بلبل و پروانۂ | ہاں براہِ سوختن مردانۂ
بے تپ ہجراں و بے ذوقِ وصال | خود بسوز و خود بساز و خود بنال
از خزان و از بہاراں در گزر | وز گدایاں قدسیہ پیشِ شہ ببر
اے شہِ والا کہ در رہ آمدی | خود گدا گشتی و خود شہ آمدی
در حریم خاص در سیرے شدی | خود یگانہ بودی و غیرے شدی
بازیِ نیرنگ خوش در باختی | اسپ و فرزین پیل و بیدق تاختی
بر کشادی پائے رفتارِ ہمہ | فرق پیدا گشت در کارِ ہمہ
لیک در معنی بغیرِ ذات نیست | اندریں بازی تراشہ مات نیست
ذاتِ تو پاکست کے گردد بدل | اے بری از رنج و آفات و خلل
ہر چہ داری نے کم آید نے فزوں | نے بہ پیشت فرقِ بیرون و درون
نے بہ پیشت جسم و جاہا را وجود | نے مکان و نے زماں وارد نمود
نے بہ پیشت ظاہر و باطن دو چیز | نے بہ پیشت اندک و بسیار نیز
نے بہ پیشِ تو فنا و نے بقا | نے بہ پیشت ابتدا و انتہا
نے بہ پیشت آسمانہا و زمین | نے شریعت نے حقیقت نے یقین
نے بہ پیشت نامہا و نے نشاں | نے بہ پیشت کفر و دیں نے ایں و آں

نے بہ پیشِ تو وجود ست و عدم | نے بہ پیشِ تو حدوث و نے قِدم
پیشِ تو تعلیل و توجیہات نیست | پیشِ تو امثال و تشبیہات نیست
نیستی ہم پیشِ تو گردید نیست | غرقۂ توحید جز توحید نیست

"چیست توحید آنکہ از غیرِ خدا
فرد آئی در خلا و در ملا"

خود تو گفتی خود تو بشنودی زخویش | خود تو رفتی آمدی خود پیش پیش
من چہ گویم من چہ باشم من کیم | خود تو بودی خود تو ہستی من نیم
چوں تو بودی چوں تو خود ہستی بپا | من کجایم من کجایم من کجا
انچہ باشی باش من باشم نہ تو | خود بہ بیں و خود بدان و خود بگو
خواہ پنہاں باش و خواہی آشکار | بیدلاں را با فضولیہا چہ کار
من ندانم تو نہانی یا عیاں | نے بگنجی در یقیں نے در گماں
گر توئی از من نے آید خبر | ور منم از تو نے یابم اثر
بے من و تو کار نکشاید بگفت | رمزِ وحدت خود نے آید بگفت
ایں عبارات و اشارات و خیال | گشتہ پیشِ سرِّ وحدت پائمال
پس چہ باشد زندگانی چیست مرگ | ذاتِ تو قائم بود بے ہیچ برگ
ذاتِ تو لاریب پاکست و صمد | نے ازل گرد تو گردد نے ابد
ہم ازل مستغرقِ تو ہم ابد | امر کردی قل ھو اللہ احد

قالِ را بگزار و حالِ خود بجو — کے بمیرد غرقۂ دریائے ہو
حال و قال از تفرقہ ظاہر شود — کیست تا از اصلِ خود ماہر شود
جمع و تفریقے ہمے گردد عیاں — اصلِ ایں ہر دو نیاید در بیاں
آگہی از سرِّ مطلق کے بود — انچہ در فہمِ تو آید شے بود
راست نبود ہر چہ گوئی زیں نمط — "خود غلط انشا غلط املا غلط"
از صحیح و از غلط ہم دور باش — ہر چہ خواہی گو بخود مسرور باش
نے غلط کردی نیاوردی صحیح — نے حسن پیداست اینجا نے قبیح
نے قبیح و نے حسن نے خوب و زشت — نیست کعبہ نیست دیر و نے کنشت
علم و عرفاں نیست گشت و فرق شد — زورق اندر بحرِ وحدت غرق شد
غرقہ را نبود مقام و منزلے — غیرِ دریا نیست او را حاصلے
بارگاہ اوست بے جا و مقام — نے نشانے باشدش نے ہیچ نام
ہر کجا سر بر زند خود جائے اوست — بے سر و سامانیش ماوائے اوست
ہست آزادہ ندارد پائے بند — نے اسیرِ وقت و نے در جائے بند
ہم زمان و ہم مکاں خیزد ازو — اعتبارِ جسم و جاں خیزد ازو
نامرادی ہم ازو مقصود ہم — عبد ازو پیدا شود معبود ہم
ہر چہ مے خیزد نہ بیرونش بود — ہر چہ غیرست آں نہ ما دونش بود
ہیچ گردد نے خود است و نے خدا — اتحادی نے حلولی نے جدا

پاک از ناپاک و پاک از پاک ہم | اصلِ نور و اصلِ نار و خاک ہم
گفتہ و ناگفتہ یکساں پیشِ اوست | دیدہ شد نادیدہ چہ دشمن چہ دوست
ہست خود تنہا و ہم خود انجمن | گاہ نو مے گردد و گاہے کہن
معنیش واحد عبارت ہا بسے | نیست نقصاں گر نہ فہمد کسے
از عبارت تا بمعنی فرق نیست | گر بدانی ظاہر و باطن یکے ست
شد عبارت زوئے معنی را حجاب | معنی آمد در عبارت آفتاب
ہم عبارت گشت معنی را شہود | در عدم معنی عبارت در وجود
ور بسنجی ایں مثالِ ہیچ ہیچ | غیرِ معنی نیست خود موجود ہیچ
معنیِ آزاد خود پابست شد | نیست شد معنی عبارت ہست شد
آں عبارت نیست خود معنی ست آں | در نہاں معنی عبارت در عیاں
نیست معنی و عبارت جز مثال | جملہ وہم ست و گمان ست و خیال
از عبارت و ز معانی پاک شو | خاکِ مردانِ خدا را خاک شو
از بیان و گفتگو لب بستہ بہ | خامہ گر جنبش کند بشکستہ بہ
ذکر و فکر و فہم و ادراک و قیاس | ایں ہمہ بگذار و ویراں کن اساس
کار دارد سوختن نے ساختن | ہست کار اینجا سپر انداختن

تشبیبِ قصیدہ

نماند تابِ فراقِ تو بیش ازیں ما را — بیار جام کہ خالی کنیم مینا را
بقطعِ وادیٔ عشقِ تو در نخستیں گام — زپا فگند جنوں عقلِ دستِ بالا را
ز تو گسستنِ پیماں ز ما درستیِ عہد — بیا کہ قاعدہ برہم زنیم دنیا را
اگر تو مے ندہی دادِ تشنہ کامیِ من — بآبِ دیدہ بگیرم عیونِ دریا را
مدارِ چرخ بہ آہے زہم نمے پاشد — چساں ز دائرۂ غم بروں کشم پا را
مرادلےست کہ از سنگ پارہ پارہ شود — بقامتم چو بدوزند حلۂ خارا
نہیم از تفِ دل داغ بردلِ آتش — بہ تندِ صرصرِ آہے دہیم صحرا را
بترس ازیں کہ توانم من از تپیدنِ دل — کہ پا برہنہ برآرم بدشت لیلےٰ را
یک امشب است بیادِ تو ہم چو روزِ شمار
بگو چہ قدر نہی وعدہ ہائے فردا را

تشبیبِ قصیدہ

اے بہ نقابِ رخت مہرِ قیامت نہاں — قامتِ موزونِ تو فتنۂ آخر زماں
عارضِ مستورِ تو بتکدہ ہا را چراغ — نرگسِ مخمورِ تو میکدہ ہا را مغاں
ہندوے زلفِ ترا حاصلِ ملکِ خطا — مردمِ چشمِ ترا کسوتِ عباسیاں

درخمِ ابروئے تو تیغ اجل معتکف — کاوشِ مژگانِ تو قبلۂ نوکِ سناں
جنبشِ بازوئے تو خون جہانے بخوت — لعلِ دل آویزِ تو کرد اشارت کہاں
وصفِ تنِ نازکت گر بزبانہا فتد — ہیچ کس از جانِ خویش باز نجوید نشاں
ابر ز جوشِ ہوس قطرہ چکاند بہ بحر — مہر ز داغِ حسد لمعہ فروشد بکاں
غیرتِ دندانِ تو آب کند آں یکے — واں دگرے بالبت سنگ بود ہمچناں
حکمِ جمالِ تو در عرشِ جہت امضا پذیر — سکۂ حُسنِ تو در ہفت قلم رو رواں
حیرتیِ روئے تو آئینہ دارد بہ پیش — حسرتیِ وصلِ تو سیر بر آید زجاں
طرزِ تو غارت گرِ دانشِ خاکِ فرنگ — نازِ تو برہم زنِ حکمتِ یونانیاں
شاہدِ خوئے ترا رنگِ حیا ہم نشیں — لیلیِ حسن ترا ناز و ادا ساربان
عشوۂ تو بردرد پردۂ زہد و ورع — غمزۂ تو بشکند حوصلۂ قدسیاں
زہرہ چو یک رہ کند در تو زشوخی نظر — سحرِ ادایت فرود آوردش ہو کشاں
گر تو کنی غمزہ را تیز بہ رسمِ ستم — مہر نماید دگر ہر ستمِ آسماں
گر ز سراپردہ خویش پائے برآری بروں — پا نہ رسد بر زمیں بسکہ سر آید براں
نازِ کمر بستنت رنگِ امیدم شکست — زاں کہ نہ گنجد ہمی کشتنِ من درمیاں

بہشتیِ اہلِ دید ہست حدیثِ کلیم
چوں تو کنی در نظر جلوہ بیک ناگہاں

قطعہ

دوش گوئی کہ در نشیمنِ قدس ‏ خیلِ روحانیاں خرامان ست
زدہ انداز نشاط انجمنے ‏ طوبیٰ و سلسبیل و رضوان ست
طوطیانند بال و پر از نور ‏ سایہ و شاخسار و ریحان ست
بلبلانند نغمہ شان تحمید ‏ چمن و گلشن و خیابان ست
قمریانند نعرہ شاں تہلیل ‏ سرو شمشاد و طرفِ بستان ست
آہوانند از سرشتِ صفا ‏ سبزہ و جوئبار و میدان ست
ماہیانند از خمیرِ ہدیٰ ‏ خضر و ساقی و آبِ حیوان ست
اخترانند از جلال و جمال ‏ آسمان و زمین زایقانِ ست
ہمہ از رحمت اہتزازِ نسیم ‏ ہمہ از فیض ابر و باران ست
خم ز تفرید و ساغر از تجرید ‏ طرفہ اجماعِ بادہ خواران ست
نعرۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ‏ از دلِ ہر کہ ہست جوشان ست
ہر کہ با من بدعوی آویزد ‏ گویم آرے دلیل و برہان ست
نہ روم بر طریقِ استدلال ‏ گر ترا نیز نقدِ ایمان ست
ورقے زیں کتاب پاک بہ بر ‏ کہ ہمانا ز عالم جان ست
بہ ہوائے طوافِ مضمونش ‏ مرغِ اندیشہ بال افشان ست

ہر کہ بر فہمِ معنیش پے برد — دلش از وجد پائے کوبان ست
فہمِ معنی کہ ہست فوزِ عظیم — نہ ز سعی ست بل ز وجدان ست
بو دلیعت دریں جریدۂ راز — گوہر و لعل و دُرّ و مرجان ست
دُرّ و مرجان و سے نہ از دریا — لعل امّا نہ از بدخشان ست
دُرّ و مرجانش از لطائفِ غیب — لعلِ رخشاں ز سرِ اعیان ست
دیدبانِ شواہدِ اکواں — ترجمانِ مظاہرِ شان ست
بہ تعجّب مبیں در اوصافش — کہ ز ملفوظِ شاہِ شاہان ست
آنکہ در پیشِ ہمتش لاشے — ہرچہ از اعتبارِ امکان ست
آنکہ در ظلِّ رایتِ فقرش — مامنِ رند و پارسایان ست
آنکہ در اوجِ عظمت و شانش — سعیِ اندیشہ ہم ز نسیان ست
آنکہ اندر فضائے مدحتِ او — رخشِ فکرت بہ ترکِ جولان ست
طورِ تحقیق را کلیم اللہ — ملکِ توحید را سلیمان ست
خرد اندیشد و زباں گوید — شرحِ اوصافِ او نہ چندان ست
دو سہ بیتے دگر کنم انشا — گرچہ ایں کار ہم نہ آسان ست
یعنی در وصفِ جامعِ ملفوظ — کہ مرآں شاہ را ز خاصان ست
راشد و مرشد ست و آلِ رسول — لمعۂ آفتابِ تابان ست
آنچہ بعد از نبی بہ امت ماند — آلِ پاکِ وے ست و قرآن ست

قبلہ گاہش بظاہر و باطن — شاہِ مردان و شیرِ یزدان ست
خرقۂ او حسینی الحسنی ست — دقعۂ حالۂ شہیدان ست
ہم بہ حکمِ طریق و ہم بہ نسب — جدِّ والاش قطبِ گیلان ست
اصلِ پاکش زیثرب و بطحاست — مولدش خطۂ خراسان ست
او فتادست در دیارِ غریب — چند روزے بہ ہند مہمان ست
ایں لآلی کہ در کتاب کشید — خوانِ یغما برائے اخوان ست
چند گویم بہ لہجۂ فارس — خاکِ میرٹھ نہ یزد و طہران ست

گفت محمودؔ سالِ ختمِ کتاب
بحرِ توحید و نورِ عرفان ست
۱۳۰۴ھ

قطعہ تاریخ

حسنؔ بنوشت ملفوظاتِ مرشد — بدل ہا ریختہ انوارِ توحید
کتابے مستطابے لاجوابے — ہمانا ابرِ گوہر بارِ توحید
بہ بیں در ہر اشارے زند جوشش — محیطِ اعظمِ زخّارِ توحید
قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید — چرائی بوالعجب درکارِ توحید

چو از توحید دیدم شرحِ اسرار
بگفتم آیتِ اسرارِ توحید
۱۳۰۴ھ

ےے بفرمایش محمد محمود فرزند اکبر مصنف ۱۳۰۴ء مولانا سید گل حسن صاحب ۱۲

قطعہ تاریخ

شد آں غوثِ علی سلطانِ ذی شان
که مارا قبلهٔ دنیا و دیں بود

مآبِ خلقِ عالم بارگاہش
تو گوئی آسمانے بر زمیں بود

شہِ فقر و فنا دریائے توحید
ورائے عرصۂ علم و یقیں بود

فریدے بے حجابے راست گوئے
بہ عرفان و حقیقت دور بیں بود

ز ہر گونہ کمالش بہرۂ خاص
نشانِ اوّلین و آخریں بود

دلش تفسیرِ لَا خَوفٌ عَلَیھِم
که فارغ از غمِ دُنیا و دیں بود

بہ ہمت پیش رو فردِ جریدہ
بہ کُنجِ خوش دلی عزلت گزیں بود

بہ توحید و توکّل یک سوارہ
بترکِ دونِ حق خلوت نشیں بود

بہ ایثار و کرم ابرِ گہربار
ظہورِ شانِ رب العالمیں بود

سخن ہائے بلند و ارجمندش
مذاقِ اہلِ حق را انگبیں بود

کلامش ہر یکے صد بابِ حکمت
نکاتش طالباں را دل نشیں بود

براتِ قسمتِ خود ہر کسے یافت
جہانے خرمنش را خوشہ چیں بود

بجیب اندر محیطِ سرمدی ذات
رموزِ وحدتش در آستیں بود

خراباتِ حقیقت را قلندر
شریعت را امام المتقیں بود

ز آب و گِل منزہ ذاتِ پاکش
اگرچہ در میانِ ما و طیں بود

کلیدے بود اسرار ازل را نقود گنج غیبی را امیں بود
ہمش حق الحقیقت بود دیہیم ہمش ملک صفا زیر نگیں بود
ندانم من چہ بود آں بحر موّاج نہ خود بود و نہ آں بود و نہ ایں بود
بروں از بود و نابود ست بودش چرا گویم چناں بود و چنیں بود
بہ بحر غیب چوں کشتی فرو برد خرد گفتا کہ خضر راہ بیں بود

دیگر

شد غوث علی شہ زمانہ سلطان حقیقت و طریقت
تاریخ وصال گفت ہاتف او بود شہنشہ حقیقت

قطعہ تاریخ وفات سر سالار جنگ بہادر

بود دستور دکن نام آورے مختار ملک در مہمات امور سلطنت با ہوش و ہنگ
ہیچ او دستور دانائے ندارد کس بیاد پاسبان امن و صلح و مال و دولت نام و ننگ
نیر بخت رعایا تافت بر اوج شرف تا زمام ملک و دولت دادہ بودندش بچنگ
فہمش آئین ریاست را ابنائے خوش نہاد نظمش از آئینہ نظم و سیاست برد زنگ
بود رائے محکمش اعضائے دولت را سپر فتنہ ہائے ملک را تدبیر دالایش خدنگ
فخر قوم و فخر ملک و حرز بازوئے دکن بوستان خلق بد احسان و سخا را آب و رنگ
عدل را نوشیروانے بخت را اسکندرے ضیغم صحرائے بینش بحر دانش را نہنگ

بیکساں را دستگیر ے خستگاں را مرہمے نیتش آں بود در دورش دلے ناید بہ تنگ

موجِ فیضانش گرفتہ چار دانگِ ہند را از لبِ رودِ کرشنا تا سرِ دریائے گنگ

لوحۂ دل پر نگار از شکرِ نعمت ہائے او در سں گاہِ قوم را طغرائے نامش نقشِ سنگ

مختصر گویم ز اوصافش کہ ارزانیش بود تن ز ہند و دیں ز یثرب دانش از ملکِ فرنگ

شور و فریادِ رعایا سدِّ راہِ او شدے عرصۂ عمرِ معیّن گر بہ پرفتے درنگ

تا بکے ایں نالہا محمودؔ تاریخش بگوئے پیکرِ آں پاک گوہر شد نہاں در خاک و سنگ

گفت ہاتف حسرتا صد حیف و صد ہیہات آہ آہ وائے دانش ہند و نازک فہم سر سالار جنگ

۱۳۰۰ھ

دو کیسہ داریم

دو کیسہ پُر از عیب داریم ما یکے پیشِ روے و یکے پشتِ سر

دراں نقصِ ہمسائگاں ست و عیب دریں زشتیِ نفسِ ما ہست و شر

ازاں ہر چہ بینیم بر کف نہیم وزیں خود نداریم علم و خبر

دراں فکرت و ہوشِ ما تیز و چست دریں دیدہ و گوشِ ما کور و کر

اگر ہست ہمسایہ ہشیار دل نہ گوید درِ جنگ باما مگر

کند چارۂ عیب و نقصانِ خویش ز بد بینیِ ما بگیرد ہنر

شود کیسہ اش از بدیہا تہی پُر د کیسۂ ما ز عیبِ دگر

چنیں ست احوالِ ما را طریق کہ فردا ز امروز آید بتر

۵۱۔ بفرمائشِ محمد محمود فرزند اکبر مصنف

بہ پیچیدہ در باطنِ دیگراں | بہ پوشیدہ از ظاہرِ خود نظر
نشستہ چناں فارغ از حالِ خویش | تو گوئی نداریم سمع و بصر
مدام ایں چنیں آں چناں فکرِ ماست | نہ با نیک رغبت نہ از بد حذر
اگر گوش داری نصیحت نیوش | کن آویزۂ گوشِ جان ایں گہر

بکن قصہ از عیبِ ہمسائگاں
بکن چارۂ خویش المختصر

غزلیات

رخِ تمثیل ہم در آئینہ نا دیدۂ گویا | بخلوت گاہِ نازآرے زخود پوشیدۂ گویا
تو در کنعانِ جسمانی و مصرِ جاں پُر از غوغا | ز پیراہانِ یوسف شمۂ نشنیدۂ گویا
پئے دُنیا کہ از طولِ امل بر بافتی دامے | بسانِ عنکبوتے بر مگس پیچیدۂ گویا
لبِ ناں آر بدست آریم و دو شاب از جگر باشد | کفافِ ما ز اقطاعِ محن بخشیدۂ گویا

بپائے لطف گشتِ بوستاں فرمائے ما ہر گل
بجائے خویش پندارد ہمش بوئیدۂ گویا

اسد اسد اصطلاحِ کہنہ از بر کردہ اند | وز تقاضائے خرد حرفے مکرر کردہ اند
بر گمانِ آں لبِ شیریں کہ جز در وہم نیست | طوطیاں منقار اندر تنگِ شکر کردہ اند
از شمیمِ زلفِ او نشنیدہ کس بوئے ہنوز | تودۂ از مشک و انبارے زعنبر کردہ اند

مے گساراں گردشِ چشمش ندیدہ یک نگاہ
برتصورِ نُقل بادامِ مُقشّر کردہ اند

در تنزّہ گفت نتواں از قد و بالائے او
حیف تشبیہے کہ با سرو صنوبر کردہ اند

نقشِ ہستی چوں سراسر ہست نیرنگِ خیال
عاقبت سربرزند وہمے کہ در سر کردہ اند

بیش و کم ہرگز نہ گردد ہر چہ ہست از نیک و بد
زانکہ پیش از بابراتِ ما مقدّر کردہ اند

از غلط کاریِ عقل ایں جہاں ہرگز مپرس
تہمتِ ہر نیک و بد بر چرخ و اختر کردہ اند

عابداں وقتِ عبادت نقشِ معبودے زنند
آشکارا شرکتے با ذاتِ داور کردہ اند

در حریمِ ذات او رہ نیست کس را اے عجب
قصہ بسیار از مقام و راہ و رہبر کردہ اند

صوفیاں از غیرِ حق تصفیۂ دل میکنند
غیرِ حق را خود چرا در دل مقرر کردہ اند

ہر کسے را اعتمادے ہست بر حُسنِ عمل
از سعادت ہائے خود ترتیبِ محضر کردہ اند

در بت و بتخانہ رو آوردہ قومے بر خیال
قومِ دیگر تکیہ بر محراب و منبر کردہ اند

عاشقاں را نیست حاصل ما یہ جز بے حاصلی
زاہداں را دست اندر سبحہ گوہر کردہ اند

آں یکے را دادہ اند اوصافِ اخلاق و ادب
واں یکے را رند و سرمست و قلندر کردہ اند

آں یکے بر آتشِ دوزخ کبابے میزند
واں یکے را مشربے از آبِ کوثر کردہ اند

کیست کو رہوار تا سر منزلِ تحقیق راند
ہر یکے را مسلکے بر نوعِ دیگر کردہ اند

بارگاہِ وحدتش را کو نشان و کو مقام
در حقیقت خود غلط بود آنچہ باور کردہ اند

نجم ذاتِ واحدست اما اسامی در مقال
ماہ و پروین و سُہا و مہرِ انور کردہ اند

۳
ہمہ اعضائے من ز پا تا سر بہ لرزد | کہ مجرم بدیوانِ داور بہ لرزد
ز لطفت نئے خامہ گوہر فشاند | ز قہرِ تو در تیغ جوہر بہ لرزد
چناں لرزد از بیمِ جاہِ تو حاسد | کہ در دورِ اسلام کافر بہ لرزد
مگر دیدہ انوارِ قلبِ منیرت | کہ ہر صبح دم مہرِ خاور بہ لرزد
مرا دل بہ لرزد زبے برگ و سازی | چناں کز سخائے تو گوہر بہ لرزد
بیا سایم از جنبش و نیست جنبش | کہ پا ماندہ بر جاے و پیکر بہ لرزد
ہمے لرزم از دستِ سرمائے ناخوش | کہ دل دادہ از شوخِ دلبر بہ لرزد
چناں حرف لرزد بہ پیشِ نگاہم | کہ اندر کفِ مست ساغر بہ لرزد
ز سرمائے دی کس نہ لرزد بسانم | مگر شاخِ عریاں ز صرصر بہ لرزد

چنین است حالم بہ ماہِ نومبر
دلِ من ز بیمِ دسمبر بہ لرزد

۴
باز بہارید ابر باز بیامد بہار | باز نوا ساز کرد مرغ سرِ شاخسار
باد وزیدن گرفت سبزہ چمیدن گرفت | جلوۂ صد رنگِ گل جوش زد از ہر کنار
باز پرندِ سحاب دامن گوہر فشاند | ہم بسرِ شہر و دہ ہم بسرِ کوہسار
غنچہ دہن باز کرد بہرِ سپاسِ خدائے | برگ ورقہا نوشت در صفتِ کردگار
تاک فتادہ ہمے مست بطرفِ چمن | سروِ سہی سربلند گشتہ لبِ جوئبار
سنبلِ پیچاں فگند طرہ فروتر ز دوش | نرگسِ شہلا کشاد دیدہ بروے بہار

۱۵ - بفرمائش عزیزی نوشتہ شد بمقام سہارنپور ۱۸۶۵ء
۱۶

بسکہ طرب عام شد کام روائی گرفت   سبزۂ بیگانہ ہم یافت دریں بزم بار
ساقی و ساغر بدست مطرب و شعرے بلب
زمزمۂ عود و چنگ جام و کفِ مے گسار

۵ تا کے بہ عدو زنم درِ صلح   اے شوخ ستیزہ کار برخیز
ناچار شدم ز شورِ ناصح   اے تہمتِ اختیار برخیز
بنشست غبار بر دلِ او   اے دیدۂ اشکبار برخیز
برخاست دلِ من از سرِ جاں   اے دلبرِ جاں شکار برخیز
اے بلبلِ نالہ مست مے نال   شد فصلِ گل و بہار برخیز
خلقے شدہ منکرِ قیامت   اے فتنۂ روزگار برخیز
من بندِ نقاب مے کشایم   اے طرۂ مشکبار برخیز
تا پردہ فتد ز کفر و ایماں
اے برقعِ روئے یار برخیز

۶ اے روے تو بے نقاب تا کے   برخود تپد آفتاب تا کے
بشکن سرِ زلفِ تابدارت   دلہا ہمہ پیچ و تاب تا کے
در روزِ شمار کس نپرسم   گیرم ز غمت حساب تا کے
حسنِ تو نقاب بر نتابد   شوخیِ تو در حجاب تا کے
صد قفل زدم درِ تمنا   دل بستۂ فتحِ باب تا کے

زاہد بہ نوائے خارج آہنگ — دل برکنی از رباب تا کے
آخر نہ کہ واژگونہ بختم — تشویش زانقلاب تا کے
ناگفتہ ہزار حرف خون شد — با غیر کنی خطاب تا کے
من تشنہ جگر ترم زتیغت — یکبار بکش عتاب تا کے

ساقی بنیم ارسزائے جامے
دوراں کندم خراب تا کے

بے نشان و بے صفت در عینِ آثار آمدی — گردِ خود در دور گردش ہم چو پرگار آمدی
یوسفِ مصرِ جمالی و زلیخائے طلب — خود شدی جنس عزیز و خود خریدار آمدی
دعوتِ دیں کردی و خود برزدی بانگِ بلا — وحیِ منزل گشتی و ہم خود باقرار آمدی
حسن چوں بے پردہ شد غوغائے عشق آمدید — طالبانِ خویش را ہم خود طلبگار آمدی
چوں بہ بے رنگی رسیدی خار و گل را سوختی — چوں برنگ و بو فتادی عینِ گلزار آمدی
چوں حجابِ خود شدی بزمِ شہود آراستی — خویشتن را غیر بنمودی باظہار آمدی
بہرِ اظہارِ شفا خود را مریضے ساختی — چارہ گر گشتی و بر بالینِ بیمار آمدی
عالم اندر رقص آمد تا خرامیدی بناز — شور در جاں ہا فتادہ تا بگفتار آمدی
ہر چہ اندیشم نہ با ایں ہمہ غیرِ تو نیست — بحرِ مواج و حباب و دُرِ شہوار آمدی
ناقۂ لیلائے حسنت چوں بہ صحرا سر نہاد — کسوتِ مجنوں بہ بر کردی و ہشیار آمدی
علم گشتی و شدی مستور اندر جبینِ کفر — رند و گمراہ و قلندر مست و سرشار آمدی

ہر چند مرا نیست بتو ہیچ کلامے ۵ ہر دم ز تو صد بار پیامے و سلامے
گفتم بتو از لب نہ بروں آمدہ حرفے رفتم بتو از جائے نہ برداشتہ گامے
آنگاہ کہ ناگاہ بہ بیگاہ رسیدیم سالیست نہ ماہیست نہ صبحیست نہ شامے
منزل گہ ما را نہ سلوکیست نہ رسمے نے ہمسفرے ہست نہ میلے نہ مقامے
آن مے کہ بخوردیم نہ در خورد عوام است خمخانۂ ما را نہ خُمے ہست نہ جامے

صد فتنہ برانگیختہ ناکردہ نگاہے
صد مرحلہ طے ساختہ ناکردہ خرامے

متفرقات

مثنویات

۱

بدریا و کان ہست گوہر بسے نیابد بہا تا نگیرد کسے
بزیر زمیں ہست خرمن ہزار ازآں کسے نیست بے کشت و کار
اگر نفع اندک دہی رائگاں بطمع زیادت ز روے گماں
ندانندت اہل خرد باہنر کہ آں نفع اندک نیابی دگر
کہ داند کہ بسیار مقسوم تست چرا میدہی آنچہ معلوم تست

۲

تناہع مبر پیش دیوانیاں کہ بسیار خواہد شد اندک نیاں

تحمل کن اندکے زیانے بمال
که خود مالِ ناقص به از پائمال

۳

جوانا جوانی مکن رائگاں
که پیری ہمے آید از پے دواں

گر امروز تدبیرِ فردا کنی
بسرمنزلِ عافیت جا کنی

ور امروز کارت بساماں نشد
دریغا که خود ایں شد و آں نشد

۴

لبِ نانے با من و آزادی
به ز حلوائے خوف و ناشادی

جائے تنگے که بے ضرر باشد
به ز ایواں که پرخطر باشد

۵

خرسےؔ با عندلیبے گفت روزے
شنیدستم که مے نالی بسوزے

بهر طرفے فتاده بر زبانہا
ز خوشں الحانیِ تو داستانہا

ولے خواہم بگوشِ خود شنیدن
بداد نغمہ ہایت وا رسیدن

درآمد بلبلِ گویا بآواز
بصد آئیں ترنّم کرد آغاز

بزیر و بم چناں آہنگ ہا کرد
که صحنِ بوستاں را پُرنوا کرد

بوجد آورد مرغانِ چمن را
نه تنہا مرغ بل سرو و سمن را

قطعات

۱

مکن زور آوری برزیردستاں
که زورت را نمے بینم بقائے

بترس از انقلابِ دہر زنہار | مکن در حقِّ مسکیناں جفاے

۲

در وطن و در سفر و در حضر | گر بودت یارِ وفادار بہ
یار کہ بگذاشت ترا در بلا | مار یقیناً زچنیں یار بہ
پشتیِ ہم جنس کند دام و دد | دام و دد از مردمِ غدّار بہ

۳

تواں برفق و مدارا بشادمانی زیست | ولے ز عربدہ خیزد نکال و بدبختی
ہر آنکہ صلح بہ ابناے جنس پیش گرفت | بروزگار نہ بیند مصیبت و سختی

۴

اے ترا دست نارسیدہ بتاک | ترش انگور را چرا گوئی
تو ز خود کردۂ نہ ترکِ ہوس | شرم بادت کہ حیلہ می جوئی

۵

دوستاں را کہ جنگ و فتنہ بخاست | دگر انجامِ نیک امید مدار
ہیچ سودے حسود را ز حسد | نیست اِلّا کشیدنِ آزار

۶

ہر آنکہ رنج و مشقت کشد ز جباراں | بر انقلابِ زماں چوں کند غم و شادی
بدست ہر کہ فتد سر بہ پیش او بنہد | از آں کہ قطع شدا و را امید آزادی

ابیات

۱

دوں ہمت است و ناکس و نامرد و بد نہاد — آں کو بمکر و حیلہ بدست آورد مراد

۲

ز حرص و طمع دور باش اے سلیم — طمع خرس را مینماید گلیم

۳

چو تیغِ راستی داری توانی لشکرے کشتن — ولیکن تیغِ فولادی نہ ہر جائے بکار آید

۴

تو بینا نۂ کے کنی قطع راہ — ز مردانِ دانا بصیرت بخواہ

۵

ہمانا کہ مغرور گردد ہلاک — کشف وار روزے در افتد بخاک

۶

جان بابا برو نکوئی کن — کہ نکوئی بلا بگرداند

۷

بخاکِ مذلت نشاند دروغ — دروغ آدمی را کند بے فروغ

۸

بوزنہ نقلِ مردمان بکند — گر تو بد کردہ ہماں بکند

۹

دیدیم صد ہزار پئے دیگران حَکَم الّا حَکَم بدیدیم از بہرِ خویش کم

۱۰

خرگوش صفت گر تو دریں خواب بمانی
ترسیم کہ خود را سرِ منزل نہ رسانی

۱۱

بدست آوردنِ دنیا ہنر نیست یکے را اگر توانی دل بدست آر

۱۲

تنہا نہ اہلِ وعظ و نصیحت شنیدہ ایم انجامِ لاف غیرِ فضیحت نہ دیدہ ایم

۱۳

بوقتِ امن و سلامت مزن زمردی لاف
کہ تو بخواب ندیدی ہنوز روزِ مصاف

۱۴

اے بسا کس کہ در زیانِ دگر خویشتن را ہمی بباد دہد

۱۵

چنانکہ نغمۂ بلبل بگوشِ خر ہیچ است
بچشمِ بے ہنراں ہمچنیں ہنر ہیچ است

۱۶

بامیدِ نفع کردن بحق بداں نکوئی
مگر ایں مثال دارد کہ شب آفتاب جوئی

۱۷

زود بینی کہ مرد سایہ پرست   در سرِ سایہ شُدے دہ از دست

—— • (✲) • ——

ضمیمہ اُردو

نوٹ۔ یہ نظمیں سوائے مثلث اور ایک غزل کے ترتیبِ کلیات کے بعد لکھی گئی ہیں احباب کی فرمائش سے بطور ضمیمہ درج کی گئیں۔

مثنوی

کوّا

کوّے ہیں سب دیکھے بھالے — چونچ بھی کالی پر بھی کالے
کالی کالی وردی سب کی — اچھی خاصی اُن کے ڈھب کی
کالی سینا کے ہیں سپاہی — ایک سی صورت ایک سیاہی
لیکن ہے آواز بُری سی — کان میں جا لگتی ہے چھُری سی
یوں تو ہے کوّا حرص کا بندہ — کچھ بھی نہ چھوڑے پاک نہ گندہ
اچھی ہے پر اُس کی یہ عادت — بھائیوں کی کرتا ہے دعوت
کوئی ذرا سی چیز جو پالے — کھائے نہ جب تک سب کو بلا لے
کھانے والے پر ہے گرتا — پیٹ کے کارن گھر گھر پھرتا
دیکھ لو! وہ دیوار پہ بیٹھا — غُلّہ کی ہے مار پہ بیٹھا
کیوں کر باندھوں اُس پہ نشانا — بے صبرا چوکنّا۔ سیانا

کائیں کائیں پنکھ پسارے — کرتا ہے یہ بھوک کے مارے
تاک رہا ہے کونا کھترا — کچھ دیکھا تو نیچے اُترا
اُس کو بس آتا ہے اُچھلنا — جانے کیا دو پاؤں سے چلنا
اُچھلا کودا لپکا سُکڑا — ہاتھ میں تھا بچّے کے ٹکڑا
آنکھ بچا کر جھٹ لے بھاگا — واہ رے تیری پھرتی کاگا!
ہاہا کرتے رہ گئے گھر کے — یہ جا وہ جا چونچ میں بھر کے
پیڑ پہ تھا چڑیا کا بسیرا — اُس کو ظالم نے جا گھیرا
ہاتھ لگا چھوٹا سا بچّا — نوچا پھاڑا کھا گیا کچّا
چڑیا رو رو جان ہے کھوتی — ہے ظالم کی جان کو روتی
چیں چیں چیں چیں دے کے دُہائی — اپنی بپتا سب کو سُنائی
کون ہے جو فریاد کو پہنچے — بے چاری کی داد کو پہنچے
پکنے پر جب مکّا آئی — کوّوں نے جا لوٹ مچائی
دودھیا بھُٹّا چونچ سے چیرا — سچ مچ کا ہے اُٹھائی گیرا
رکھوالے نے پائی آہٹ — گوپھن لے کر اُٹّھا جھٹ پٹ
"ہُریا ہریا" شور مچا کر — ڈھیلا مارا تڑ سے گھُما کر
سُن کے تڑاقا کوّا بھاگا — تھوڑی دیر میں پھر جا لاگا
لالچ خورا ڈھیٹ نڈر ہے — ڈانٹو سے کچھ اِس میں کسر ہے؟

ڈانکو ہے یا چور اُچکّا
پر ہے اپنی دُھن کا پکّا

مثلث

خوشی اک مشغلہ ہو رات دن کا شمار افزوں ہو اُس کے سال و سن کا
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہے امن اُس کی شہنشاہی میں ہر جا سُکھی ہیں آج راجا اور پرجا
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

کوئن دنیا کے ہر خطّہ میں نامی غریبوں اور مسکینوں کی حامی
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

رعایا تن کوئن اِس تن کی جاں ہے خدا کی خلق پر وہ مہرباں ہے
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

دعا گو اُس کا پورب اور پچھاں بھی فرنگستان بھی ہندوستاں بھی
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

رہے زندہ کوئن با دولت و بخت رہے محفوظ اُس کا تاج اور تخت
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہیں اکثر ساکنانِ ربعِ مسکوں کوئن کے حکم میں مامون و مصئون

خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہے اُس کا مُلکِ راحت کا ٹھکانا
زمانہ اُس کا ہے طُرفہ زمانہ
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

سبھی احسان اُس کا مانتے ہیں
اُسے پیارا شہنشہ جانتے ہیں
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

ہیں اُس کے عہد میں انسان بڑھتے
نہالِ تازہ ہیں پروان چڑھتے
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

سمندر۔ شہر۔ جنگل۔ اور پربت
بنے گلزار ہیں اُس کی بدولت
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

نظام[1] الدین کی ہے التجا یہ
نکلتی ہے تہِ دل سے دعا یہ
خدا حافظ خدا حافظ کوئن کا

قطعات

(۱) مسلمانوں کی تعلیم

اے[2] خوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا شاندار
کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل

دم بدم راہِ طلب میں کر رہی ہو دوڑ دھوپ
ایک نقطہ پر نہ ہو اُس کو توقف ایک پل

---

[1] یہ نظم شیخ نظام الدین صاحب نبیرۂ خان بہادر حافظ عبدالکریم مرحوم سی آئی ای رئیس لال کورتی نے جلسہ سالگرہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا میں پڑھی تھی ۱۲

[2] ۳۰ اپریل [illegible] کو بمقام علیگڈھ ٹیچرز کانفرنس میں پڑھا گیا۔

رفتہ رفتہ بن گئی ہو علم کی کشور کشا
ہوتے ہوتے ہو گئی ہو مردِ میدانِ عمل
کیوں نہ ہو اُس قوم کی دُنیا کے ہر گوشہ میں ساکھ
جس میں اخلاقی سکت ہو اور ہو حکمت کا بَل
وقت کو دولت کو طاقت کو نہ کھوئے رائگاں
کھو دے احیاناً تو حاصل بھی کرے نعم البدل
ہچکچاتی ہو پہاڑوں سے نہ دریا سے رُکے
ہمتیں ہوں اُس کی عالی عزم ہوں اُس کے اٹل۔
حسرتا وہ قومِ ناقابل کہ ہو ننگِ سلف
کاہلی سے دست و بازو ہو گئے ہوں جس کے شل
اُس کی طاقت کیا؟ کہ ہوں اوروں سے کم جس کے نفوس
اُس کی عزت کیا؟ جو ہو پس ماندۂ علم و عمل
اُس کی دولت کیا؟ کہ ہوں افراد جس کے بے ہنر
مفلسی بھی اور دماغوں میں مشیخت کا خلل
کر دیا ہے خانہ برباد آج اُسے اسراف نے
جس کو قدرت نے دئیے تھے سیکڑوں سنگیں محل
خیر جو گزرا سو گزرا یہ جو ہیں تازہ نہال

فکر اِن کی چاہیئے شاید یہی جائیں سنبھل
ان کو بار آور بناؤ خواہ بے کار و فضول
آج جس سانچے میں ڈھالو گے انھیں جائیں گے ڈھل
کھیت میں پیدا ہوں پودے اور نہ سینچو وقت پر
ہے نتیجہ صاف ظاہر دھوپ سے جائیں گے جل
سوکھ کر جھڑ جائیں کلیاں اور نہ چیتے باغباں
ایسے ظالم باغباں کو کیا ملے گا خاک پھل
جی چرانا کام سے اور کام یابی کا یقیں
اے عزیزو! ہے خلافِ حکمِ حق عزّوجل
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی پڑھتے تو ہو
لیکن اس پڑھنے کا اے حضرات! آخر ماحصل؟
شہد کی مکھّی کو دیکھو کس قدر مصروف ہے
چوس کر ہر پھول سے لاتی ہے بے چاری عسل
اپنے بچّوں کے لئے کرتی ہے آذوقہ تلاش
آخرش آتے ہیں بچّوں کے بھی پر پرزے نکل
یہ نئی تانتی ہماری کیا کرے گی بھاگ دوڑ
تنگنائے کاہلی میں جب بڑے جائیں پھسل

بعض کہتے ہیں بڑھو آگے کہ ہے میداں وسیع
بعض کہتے ہیں کہ ہیں یہ کہنے والے مبتذل
دیکھنا! تم ٹس سے مس ہرگز نہ ہونا ایک انچ
بڑھ گئے آگے تو آ جائے گا ایماں میں خلل
اُن کا کہنا مانئے یا ان کی خاطر کیجیے
اپنا عقدہ کیجئے اب اپنے ہی ناخن سے حل
تیز کر اپنی توجہ کی کرن اے آفتاب[۵۱]!
تاکہ جائے عادتوں سے برف سستی کی پگھل
تیری سرگرمی سمندر سے اٹھائے گی بخار
پھر ہوا میں جمع ہوں گے بادلوں کے دَل کے دَل
دشت اور کہسار پر برسیں گے ایک دن جھوم جھوم
ایک ہو جائے گا آخر دیکھنا! جل اور تھل
پھر تو ہو جائے گی یہ مردہ زمیں باغ و بہار
پھر تو کھل جائیں گے پژمردہ دلوں کے بھی کنول
دل نہ ہو درد آشنا تو نظم ہے اک دردِ سر
کیا رباعی کیا قصیدہ کیا مخمس کیا غزل
جملہ ڈیلیگیٹ سے اب خیر مقدم عرض ہے

۵۱- آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا - علی گڈھ

اور پریزیڈنٹ[1] کی خدمت میں شکریہ ڈبل

(۳) قطعہ وفات ملک معظم ایڈورڈ ہفتم آنجہانی

رحلت ایڈورڈ ہفتم[2] پیش آئی یک بہ یک
اس وقوعہ کا نہ تھا ہرگز کسی کو بھی خیال
ہم نہ بھولے تھے ابھی وکٹوریہ عُظمٰے کا غم
کیوں کہ گزرے تھے ابھی اس حادثہ پر چند سال
چند سالہ سلطنت میں شاہِ والا جاہ نے
کردیا سب پر عیاں اپنی لیاقت کا کمال
ملکِ افریقہ میں قومِ بور کو بخشا عروج
باوجودِ فتح مندی چھوڑ دی جنگ وجدال
کس قدر ہم عصر شاہوں سے بڑھائی آشتی
کس قدر ہمسایہ ملکوں سے بنا ہا اعتدال
بن گئے یارانِ مخلص پیرس و پیٹرس برگ
ڈھل گئی انگلش کی جانب سے جو تھی گردِ ملال
جرمن و اسپینیر رومی و یونانی و ترک
صلح جو ایڈورڈ نے سب کی بدل دی چال ڈھال

[1] شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ [2] مرتبہ ۱۰ مئی ۱۹۱۰ء

پیس میکر بزمِ اعظم میں ہوا اُس کا لقب
بڑھ گیا برطانیہ کا اور بھی عزّ و جلال
کی تھی دورانِ ولی عہدی میں سیر اِس ملک میں
تھی عنایت کی نظر ہندوستاں کے حسب حال
ہفتمِ ماہِ مئی کو بج گیا کوسِ رحیل
عیسوی اُنّیس صدیاں اور یہ دسواں ہے سال
اب دعا ہے جارج پنجم جانشینِ سلطنت
مدتوں پھولے پھلے دُنیا میں یہ تازہ نہال
سب کے دل پر نقش ہیں اِس خانداں کی نیکیاں
اُن کے حق میں ہے رعایا کا دعا گو بال بال
دودمانِ شاہ کو اللہ دے صبر و سکوں
دولت و اقبال روز افزوں رہے اور ملک و مال

(۳) مسلمان اور انگریزی تعلیم

ایک دن تھا بحکمِ سرکاری — گئے اسکول جا بجا کھولے
نہ تو کچھ فیس تھی نہ داخلہ تھا — مفت تعلیم تھی اُسے جو لے
ہم مسلمان سب اکڑ بیٹھے — پہلے فتوے لے جواز کا ہولے

مُنہ زبانی بھی اور لکھ کر بھی　پوچھ گچھ کی تو مولوی بولے
"وہ ایسی تعلیم سے تو بہتر ہے　آدمی ٹوکری کہیں ڈھولے"
اُن کو تنقیص دین کی سوجھی　تھے تعصّب کے آنکھ میں پھولے
وہم و وسواس کے رہے چلتے　سالہا سال توپ اور گولے
انتظامِ اُمورِ دُنیا کو　کیا سمجھتے یہ جنّتی بھولے
جس کو ہو کچھ بھی فہم سے بہرہ　اپنے شربت میں زہر یوں گھولے
رہ نہ بے خبر تو بات کو پھر　کون میزانِ عقل میں تولے
رہے علمِ معاش سے کورے　شہر قصبے محلّے اور ٹولے
ہیں ہمارے جو اور ہمسایے　گویا بیٹھے ہی تھے وہ مُنہ کھولے
خوانِ یغما پہ جا کے ٹوٹ پڑے　بھر لئے ٹھونس ٹھونس کر جھولے
لگی ہلدی نہ پھٹکری اور مفت　خوب موتی معاش کے رولے
محکموں کی پلٹ گئی کایا　آفسوں کے بدل گئے چولے
کہا سیّد نے قوم سے "ناداں!　تو بھی اُٹھ بیٹھ ہاتھ مُنہ دھولے
پیچھے امیدِ جمع خرمن کر　پہلے کھیتوں میں بیج تو بولے"
تب ہوئی کچھ جھجک ہماری دور　اور ہم نے بھی بال و پر کھولے
مگر اس فیس کی گرانی کے　متواتر لگے وہ ہچکولے
حوصلہ کا نکل گیا بھُرکس　اور ہمّت کے ہو گئے ہولے

الغرض وہ مثل ہوئی اپنی
"سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے"

غریب اور امیر

خوش ہیں غریب اپنے اُن جھونپڑوں کے اندر
جو دھوپ کی تپش سے دوزخ کی بھٹّیاں ہیں
شاکی ہیں اہلِ دولت حالاں کہ اُن کے گھر میں
پنکھا بھی کھنچ رہا ہے اور خَس کی ٹٹّیاں ہیں

غزلیات

سر زمینِ ہند کا میوہ ہے پھوٹ
بوالہوس گرتے ہیں اُس پر ٹوٹ ٹوٹ
نُچ کھسٹ کر رہ گیا مفلس چمن
یہ خزاں تھی یا کہ پنڈاروں کی لوٹ
ہو چکی میعادِ ایّامِ بہار
غنچہ و گل رو رہے ہیں پھوٹ پھوٹ
جا کہیں سے مول لا عقلِ فرنگ
کیا ہوا پہنا اگر ڈاسن کا بوٹ
صانعِ قدرت نے بھر دیں کس قدر
صنعتیں یورپ کے سر میں کوٹ کوٹ
زالِ دُنیا کی نمائش دیکھ کر
اچّھے اچھّوں کا وضو جاتا ہے ٹوٹ
سچ کی پاؤ گے صدا ہر دم کڑی
آخرش چیں بول ہی جاتا ہے جھوٹ

دایۂ ابرِ بہاری واہ وا! گل زمیں کو خوب پہنایا ہے سوٹ
چھٹتی ہیں فقروں کی آتشبازیاں جب کبھی آپس میں ہو جاتی ہے چھوٹ
بیٹھ کر کالج میں انگریزی علوم رٹ لیے لیکن نہ پایا اُن کا روٹ
بے ہنر ہاتھوں میں ہیں بے کار سے مالوے کی روئی بنگالے کا جوٹ

کیا ہمارے شعر اور کیا شاعری
گا ہے ماہے اور وہ بھی جھوٹ موٹ

مانعِ[1] سرگشتگی وہ سنگِ در[2] ہوتا نہیں
پھوڑنا سر کا علاجِ دردِ سر ہوتا نہیں
حیف دُنیا! ہائے عقبیٰ! منزلِ دلبر ہے دُور
دل جو اس رستہ میں کھٹکا طے سفر ہوتا نہیں
یاد اور امید کی دولت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کھانے سے دنیا میں گزر ہوتا نہیں
دعوے الفت ہے کچا جو نہ ہو دل میں طپش
بے حرارت تو کبھی پختہ ثمر ہوتا نہیں
خوفِ جاں سے نامہ بر جانے کی ہامی کیوں بھرے
رشک سے یاں اعتبارِ نامہ بر ہوتا نہیں
صدمۂ دل کوبِ فرقت امتحانِ عشق ہے

سالہ مرتبہ ۲۱ ستمبر ۱۸۷۳ء

بے پسے سرمہ بھی منظورِ نظر ہوتا نہیں
ہے شعورِ ماسوا بھی اِک حجابِ آگہی
بے خبر جب تک نہ ہو لے باخبر ہوتا نہیں

رباعیات

(۱) ہمّت

تاریک ہے رات اور دریا زخّار طوفان بپا ہے اور کشتی بے کار
گھبرائیو مت کہ ہے مددگار خدا ہمّت ہے تو جالگاؤ کھیوا اُس پار

(۲) ہمت

انسان کو چاہیے نہ ہمت ہارے میدانِ طلب میں ہاتھ بڑھ کر مارے
جو علم و ہنر میں لے گئے ہیں بازی ہر کام میں ہیں اُنھیں کے وارے نیارے

(۳) مسلمانوں کی تعلیم

قلّاش ہے قوم تو پڑھے گی کیوں کر پس ماندہ ہے اب تو پھر بڑھے گی کیوں کر
بچّوں کے لیے نہیں ہے اسکول کی فیس یہ بیل کھو منڈھے چڑھے گی کیوں کر

(۴) جھوٹی نفرت

لاکھوں چیزیں بنا کے بھیجیں انگریز سب کرتے ہیں دنداں ہوس اُن پر تیز
چڑتے ہیں مگر علومِ انگریزی سے گڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز

(۵) مقصودِ عالم انسان ہے

یہ مسئلہ دقیق سُنئے ہم سے آدم ہے مرادِ ہستیِ عالم سے
ہم اصل ہیں اور یہ ہمارا سایہ عالم کا وجود ہے ہمارے دم سے



طبع اوّل ستمبر سنہ ۱۹۱ء

میرٹھ

غ